مہکار

شکیل ابن شرف

zeba arts : 9372126775

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ ۃ

مہکار

شکیلؔ ابن شرفؔ......دھولیہ۔

یہ کتاب مہاراشٹر اسٹیٹ ارد و ساہتیہ اکادیمی کی مالی اعانت سے شائع کی گئی ہے۔

نام کتاب	......	مہکار
شاعر	......	شکیلؔ ابن شرفؔ
سالِ اشاعت	......	جولائی 2012
تعداد	......	1000
کتابت	......	عنم آرٹس
سرِ ورق	......	نورانی پریس، مالیگاؤں۔
ناشر	......	بزمِ محبانِ شکیلؔ...دھولیہ۔
قیمت	......	150 روپے
طباعت	......	نورانی پریس، مالیگاؤں۔

ملنے کے پتے......

شکیل ابن شرفؔ...... تاشہ گلی نمبر ۸، دھولیہ۔8975102459

نسرین بُکڈپو... راحت کلینک کے سامنے، نندی روڈ، دھولیہ۔

اِسلامِک بُک سیلرس... نزد منشی مسجد، مسلم نگر، دھولیہ۔

شبنم بُک اسٹال...... قصاب باڑہ مسجد، مچھلی بازار، دھولیہ۔

مدینہ بک ڈپو...... جامع مسجد کے سامنے، مولوی گنج، دھولیہ۔

انتساب

☆

والدِ محترم ”محمد یحییٰ شرف“

اور

مادرِ محترم ”مریم بی“

کے نام

جن کی کمی بچپن سے

آج تک محسوس کر رہا ہوں۔

نمبر	عنوان	صفحہ نمبر

"مہکار" ایک اضافہ

ڈاکٹر تابش مہدی

جناب شکیلؔ ابن شرفؔ مہاراشٹر خصوصاً اس کے مردم خیز خطے خاندیش کے نامور شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہاں کے علمی، ادبی اور سماجی طبقے میں انھیں خاصی پذیرائی حاصل ہے اور متعدد اربابِ علم و ادب نے اپنے مضامین میں ان کی ادبی اور سخن ورانہ حیثیت کا اعتراف کیا ہے۔ میں نے نہ کبھی اُن کو دیکھا ہے اور نہ کبھی میری ان سے خط و کتابت رہی ہے۔ میری جو کچھ بھی اُن سے واقفیت ہے وہ ان کے ان اشعار کے واسطے سے ہے جو رسائل یا جرائد یا کسی دوسرے ذرائع سے مجھ تک پہنچتے رہے ہیں لیکن جب بھی ان کے اشعار کہیں پڑھنے یا سُننے کو مِلے، دامن کش ہوئے، کچھ سوچنے، غور کرنے اور کوئی رائے قائم کرنے پر مجبور کیا۔

شکیلؔ ابن شرفؔ کے اشعار سے یک گونہ تازگی اور نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کے ذخیرۂ شعری میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں موجودہ عہد کے سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا سامان ہے اور ایسے بھی جو سنجیدہ اور شعر فہم طبقے کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن دونوں ہی صورتوں میں وہ جو اسلوب اختیار کرتے ہیں وہ ان کا اپنا اسلوب ہے۔ اس پر کسی چربے یا نقّالی کی پھبتی نہیں کسی جاسکتی۔ میں اِسے کسی شاعر کے لیے ایک بڑی کامیابی تصور کرتا ہوں۔ آگے بڑھنے سے پہلے اُن کی نعت کے یہ چار شعر ملاحظہ کریں ؎

مِرے آقاؐ کا ہر انداز دُنیا سے نِرالا ہے   دُعائیں کون دیتا ہے بھلا ایذا رسانی پر

بنا دے اے خدا! مجھ کو کبوتر اُن کے روضے کا   کبھی دالان میں اُتروں کبھی بیٹھوں کمانی پر

سُنا ہے اُن کی خوشبو آج بھی محسوس ہوتی ہے   مِرے حصے میں بھی یارب مدینے کی گلی آئے

مجھے دھڑکا لگا رہتا ہے اپنی نارسائی کا   درِ سرکارؐ تک پہنچوں تو میرے جی میں جی آئے

پہلے شعر میں تکلیفیں اور اذیتیں پہنچانے والوں کو دُعائیں دینا سیرتِ رسولِ کائنات ﷺ کی انفرادیت بتایا گیا ہے۔ دوسرے شعر میں کبوتر بن کے روضۂ اقدس ﷺ پر بیٹھنے کی تمنا کی

گئی ہے۔تیسرے شعر میں مدینۃ الرسول ﷺ میں حاضری کی آرزو کی گئی ہے اور چوتھے شعر میں شاعر کو اِس بات کا خدشہ ہے کہ کہیں میری قسمت کی نارسائی کی وجہ سے ایسا نہ ہو کہ میں درِ سرکار ﷺ تک پہنچنے سے پہلے ہی اِس دُنیا سے رُخصت ہو جاؤں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو ہر مومن کے دِل میں رہتی ہیں اور ہر صاحب ایمان شاعر نے ان کو شعری جامہ پہنایا ہے لیکن ان باتوں کو ادا کرنے کے لیے شکیلؔ ابن شرفؔ نے جو اسلوب اختیار کیا ہے اور جن شعریات کو استعمال کیا ہے وہ ان کا اپنا اسلوب ہے اور ان کی اپنی شعریات ہیں۔

شکیلؔ ابن شرفؔ کی غزلوں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غمِ جاناں کو غمِ دوراں بنانے کا ہُنر جانتے ہیں۔ اُن کے یہاں اپنے عہد سے کامِل باخبری مِلتی ہے۔ وہ حال کے ناقد بھی ہیں اور مستقبل کے فکر مند بھی، وہ حال کی تاریکیوں پر نالہ و ماتم کی بجائے مستقبل کا چراغ روشن کرنے کے قائل ہیں اُن کے اِس قسم کے اشعار ان کے اِسی رویّے کی نشان دہی کرتے ہیں ؎

کبھی کسی کے بھروسے پہ جنگ مت کرنا　　کوئی کسی سے اُلجھتا نہیں کسی کے لیے

روشن جب تک ذہنوں کی قندیل نہ ہو گی　　اچھی باتوں کی ہرگز ترسیل نہ ہو گی

بھولے سے بھی لبوں کو کبھی وا نہیں کیا　　اپنی طلب کو ہم نے تماشہ نہیں کیا

آنکھیں ہیں بینائی سے محروم شکیلؔ　　سورج پہ الزام لگایا جاتا ہے

خونِ دِل، خونِ جگر، خونِ تمنّا کے سوا　　زندگی! پیش تجھے کون سا مشروب کروں

تیرا کیا کہنا ہے بول　　اِس کی اُس کی بات نہ کر

میری اِس گفتگو سے یہ نا سمجھ لیا جائے کہ شکیلؔ ابن شرفؔ صرف عصری احساسات ہی کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں اور تغزل سے ان کی شاعری کا کوئی علاقہ نہیں ہے ؎

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے　　اُن کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

تغزل اردو شاعری کی جان ہے۔ اس سے کوئی شاعر دامن کش نہیں ہو سکتا۔ اقبالؔ جیسے حکیم و فلسفی کے یہاں بھی خالص تغزل کے اشعار مل جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ

شکیلؔ کے یہاں تغزل کے اشعار نہ پائے جائیں ان کے درج ذیل اشعار ان کی کامل تغزل پسندی کی نمائندگی کرتے ہیں۔

گل کو شرمندہ کروں چاند کو محجوب کروں　　اک غزل اور ترے نام سے منسوب کروں

جب پڑھتا ہوں اس خط کو مہک اٹھتا ہے کمرہ　　معلوم نہیں کون سی خوشبو میں بسا ہے

تنہائی بھی وہ رنگ دکھاتی ہے کہ اکثر　　محسوس یہ ہوتا ہے کوئی بول رہا ہے

وقت بدلا ہے، مگر چاہت نہیں بدلی مری　　دل کا دروازہ کھلا ہے آج بھی تیرے لئے

وہ نہیں آیا ہم نے سو سو بار　　صاف کمرے کا کونا کونا کیا

کس قدر ضبط کیا ہم نے یہ جی جانتا ہے　　ذکر کرتے رہے احباب لگاتار ترا

ان کے ہاں تغزل کا یہ پاکیزہ رنگ بھی ملتا ہے ؎

ہو گیا دنیا کی نظروں میں مقدس وہ مقام　　میں جہاں ٹھہرا تھا آکر دو گھڑی تیرے لئے

حقیقت یہ ہے کہ شکیلؔ ابن شرف کے ہاں ہمیں تغزل بھی ملتا ہے اور تفکر بھی ان کے ہاں عصری حسّیت کی بھی کارفرمائی ملتی ہے اور اس عوامی شاعری کی بھی، جسے ہم مشاعراتی شاعری سے تعبیر کرتے ہیں اور ان سب کے ساتھ ساتھ وہ سوچ اور فکر بھی ملتی ہے، جسے نئی نسل کے لئے مشعل راہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ وہ ایک پر گو قادر الکلام اور منفرد انداز و اسلوب کے شاعر ہیں یقین ہے کہ ان کا زیر نظر مجموعۂ سخن اردو ادب کے ذخیرے میں ایک اچھا اضافہ ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر تابش مہدی　۲۰۱۲

بیۃ الراضیہ

جی، ۵/اے، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

رابطہ 9818327947, 9999223268

مٹیالے لفظ سنہرے شعر

ڈاکٹر اشفاق انجم، مالیگاؤں

حروف والفاظ تحریر میں شکلیں اور بولنے میں آوازیں ہیں، الفاظ کی فنکارانہ ترتیب نغمہ و آہنگ پیدا کرتی ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے سُروں کی ماہرانہ بندش سے خوبصورت راگ وجود میں آتے ہیں، اگر ایک بھی سُر غلط لگ گیا تو سارے ساز بکھر جاتے ہیں۔ بعینہ شعر میں اگر کوئی ایک لفظ غلط یا بے محل راہ پا گیا تو شعریت متاثر ہوتی ہے، شعر بے معنیٰ ہو جاتا ہے۔ الفاظ تنہا اپنے جامع معنی رکھتے ہیں لیکن جب انہیں اشعار میں برتا جاتا ہے تو ان کی معنویت کے نئے نئے پہلو اُجاگر ہوتے ہیں۔ ہر شاعر کے کچھ مخصوص پسندیدہ الفاظ، تراکیب وعلائم وتشبیہات ہوتی ہیں جنہیں وہ چابک دستی سے استعمال کرتا ہے۔ تو ان سے اُس کا ذاتی اسلوب تشکیل پاتا ہے۔ جو اُسے ہم عصروں میں ایک انفرادی شناخت عطا کرتا ہے۔ جس کی بنا پر ہزاروں آوازوں کے درمیان اُس کی آواز صاف طور پر پہچانی جاسکتی ہے۔

شہر دھولیہ اردو زبان وادب کا مرکز ہے اس کی مٹی بڑی زرخیز ہے۔ جس کی شعری روایت ایک صدی سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں شعرائے دھولیہ کی تین نسلوں سے نہ صرف آگاہ وآشنا ہوں بلکہ ان میں سے بیشتر شعراء سے میرے خردسانہ، دوستانہ ،مخلصانہ تعلقات رہے ہیں۔ حضرت زاہد، حضرت موسیٰ کلیم، حضرت شرف بن یحییٰ جیسے بزرگوں کی شفقتیں میرے میرے شامل حال رہی ہیں تو علیم ابن کلیم، سعید عدم، رزاق انور، مختار انصاری سے دوستانہ و بے تکلفانہ تعلقات رہے ہیں اور آج عاجز پرتا پگڈھی اسی نسل کی امانت اور یادگار ہیں۔ یہ تمام شعراء روایتی غزل کے امین ہیں لیکن ان کا اپنا لہجہ اور اپنی فکر ہے۔۔ ان شعراء نے اپنے پیش رؤوں کی روایت کی اندھی اور لاشعوری تقلید نہیں کی جن کے یہاں غزل، نظم، حمد، نعت، منقبت، سلام مرثیہ سبھی کچھ موجود تھا جس کی وجہ سے ان متقدمین کا کوئی انفرادی اسلوب اُبھر کر سامنے نہیں آیا، لیکن سعید عدم، مختار انصاری اور عاجز پرتا پگڈھی کے عہد میں یہاں غزل پوری توانائی کے ساتھ اُبھری

جس نے نئی نسل پر نہایت خوبصورت اور مثبت اثرات مرتب کیے جس کی سب سے بہترین مثال شکیلؔ ابن شرفؔ ہے جسے میں صاحب اسلوب شاعر تسلیم کرتا ہوں۔ یہ تنہا شاعر ہے جو اپنے شہر کی مضبوط روایتی فصیل کو توڑ کر جہانِ ادب میں نہایت اعتماد و طمطراق سے داخل ہوا ہے۔ شاعر کو جب اپنے آپ پر اعتماد ہوتا ہے تو وہ تخلیق ادب میں بھی محتاط ہوتا ہے اور وہی چیز پیش کرتا ہے جو ادب کے معیار پر کھری اُترے شکیلؔ ابن شرفؔ جیسی پُر اعتماد و پر شکوہ آواز پہلی بار دھولیہ کی فضاؤں میں گونجی ہے اور اہلِ دھولیہ نے اس کا پُر جوش استقبال بھی کیا ہے۔ جب کسی شاعر کو ایسا اعتماد ایسی پذیرائی اور خوسگوار فضا میسر ہو تو پھر اُسے یہ کہنے کا حق ہے ؎

سخت مشکل تھا جس کا ہونا کیا   لفظ مٹی تھے میں نے سونا کیا

مٹیالے لفظوں سے سنہرے شعر تخلیق کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے یہ اُن کا حصہ ہے جو لہو کو روشنائی اور دامنِ چاک چاک کو قرطاس بناتے ہیں جن کے آنسو الفاظ کی رگوں میں خون بن کر دوڑتے ہیں شکیلؔ ابن شرفؔ کی شاعری انہیں علائم سے عبارت ہے۔

ایک زمانہ تھا جب شاعری مختلف دبستانوں میں بٹی ہوئی تھی اور صرف ادب تخلیق ہو رہا تھا جس میں انسان اور زندگی کم ہی نظر آتے ہیں۔ محمد حسین آزادؔ اور حالیؔ نے پہلی بار ان دبستانوں کے مقفل دروازے کھول کر اردو ادب کو نئی فضاؤں سے روشناس کرایا، مختلف تحریکیں وجود میں آئیں اور ادب زندگی کا نمائندہ بن گیا۔

شکیلؔ ابن شرفؔ کی شاعری اسی ادب کی بہترین مثال ہے اس میں وہ خود ہی نہیں اس کے سماج، اُس کے حالات، اس کے دوست دُشمن، اس کے رنج و غم، اس کے لطیف جذبات سبھی سانس لے رہے ہیں۔ اس صورت میں شکیلؔ ابن شرفؔ کی شاعری اس کا اپنا ہی نہیں دُنیا کا زندگی نامہ بن گئی ہے۔

خیال اور تجربے کو شعر بنانا پتھر سے پانی نچوڑنا ہے یہ انہیں کا حصہ ہے جو خود کو ریاضت کی بھٹی میں تپا تپا کر کندن کر لیتے ہیں۔ شکیلؔ ابن شرفؔ کی تمام تر شاعری اس بات کا اعلامیہ ہے کہ

اس نے زندگی گزاری نہیں جھیلی ہے ؎

ڈھونڈتے کیا ہو میری آنکھوں میں　　　آنسوؤں کے سوا دھرا کیا ہے

آنکھوں میں آنسو اُسی وقت آتے ہیں جب درد اور احساس مجبوری شدید ہو جاتا ہے ایسے عالم میں تسکین قلب کا ایک ہی نسخہ ہے کہ غم کو دوا بنا لیا جائے، شکیلؔ ابن شرفؔ نے یہی کیا ؎

کون اپنا تھا غم و رنج و مصائب کے سوا　　　انہیں بے چاروں نے مِل جُل کے سنبھالا ہم کو

غم و آلام جسے سنبھالا دیتے ہیں تو وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ ایسا آئینہ بن جاتا ہے جس میں ہر عکس اصل کے مطابق اور واضح نظر آتا ہے۔ آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا چاہے اس پر پتھر ہی کیوں نہ برس پڑیں اس کی ہر کرچی میں اصل چہرہ ہی نظر آئے گا۔ شکیلؔ ابن شرفؔ کے یہاں سچ مختلف سطحوں سے ابھرتا ہے، ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم آج سچ کو طنز، الزام اور بہتان سمجھنے لگے ہیں اور شکیلؔ ابن شرفؔ کی اس عادت نے دوست کم دُشمن زیادہ بنائے ہیں جس کا اُسے بھی احساس ہے لیکن وہ سچ کی قدر و قیمت جانتا ہے اسی لیے اس سے دست بردار نہیں ہونا چاہتا ؎

سچ کہنے کی عادت نے کہیں کا نہیں رکھا　　　بے وجہ کوئی ہم سے خفا ہو تو کہیں بھی

کیوں نہ ہم شرم سے منہ اپنا چھپانے لگ جائیں　　　سارے احباب جب احسان جتانے لگ جائیں

پڑتا ہے مجھ پہ سچ کا بھی دورہ کبھی کبھی　　　ناراض اس قدر مِری تقریر سے نہ ہو

جب انسان پر سچ کا دورہ پڑنے لگتا ہے تو پھر وہ بے باک ہو جاتا ہے اور اچھے اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ مقابل کیسا ہی ہو وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسی کے لہجے میں بات کرتا ہے پھر نتیجہ جو بھی ہو ؎

اثر پذیر طبیعت کا ہے قصور اے دوست　　　جو تجھ سے کی ترِے لہجہ میں گفتگو میں نے

جب کوئی شخص مقابل کے لہجے میں بات کرنے لگتا ہے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ اپنے مزاج و فکر کے خلاف کسی طرح کا سمجھوتہ کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ اور اس کا نتیجہ ناراضگی و دشمنی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ شکیلؔ کے یہی اوصافِ حمیدہ اس کی زندگی میں مصائب و مسائل پیدا

کرتے ہیں وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جب دنیا نے کسی کا ساتھ نہیں دیا ہے تو اسکی کس طرح ہوسکتی ہے اس لئے وہ اسے حقارت سے ٹھرا دیتا ہے۔

کس کی ہوئی تو اے دنیا　　　　چل ہٹ مجھ سے بات نہ کر

شعر میں ''چل ہٹ'' کا ٹکڑا عجیب کیفیت کا حامل ہے اس میں حقارت بھی ہے جھنجھلاہٹ اور بیزاری بھی ہے۔اس کے ساتھ ہی شاعر کے سابقہ تجربات بھی موجود ہیں جنکی تلخیاں آج بھی اسے بدمزہ کئے ہوئے ہیں ان تمام تجربات نے اسے دنیا ہی سے آشنا نہیں کیا بلکہ اسے حقیقت نگر بھی بنا دیا ہے ؂

جھرّیاں پڑ گئیں ہیں چہرے پر　　　　آئینے مسکرا کے دیکھتے ہیں

بڑا خوبصورت شعر ہے۔اس میں شاعر کی حقیقت پسندی ہی نہیں بلکہ انسانی نفسیات کا یہ پہلو بھی نمایاں ہے کہ انسان اپنے ''بڑھاپے'' کو جلد قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا اور خود کو جوان دکھلانے کے لیے آئینے کے سامنے بننے سنورنے کے لیے ایسی ایسی حرکت کرتا ہے جو عام حالات میں کسی صحیح الدماغ انسان سے تصور نہیں کی جاسکتیں لیکن آئینہ تو غازے کے پیچھے چھپے ہوئے چہرے کو جانتا ہے پھر اس کا مسکرانا جائز ہی تو ہے۔یہاں آئینے کو دوشیزاؤں کی علامت سمجھ لیں تو شعر اور بھی مزہ دیتا ہے۔یہ حق نگری وحقیقت پسندی شاعر کو آخر کار اس مقام تک لے آتی ہے ؂

معلوم ہوا یہ کہ ہوں خود اپنا ہی دُشمن　　　　پہنچا ہے مری ذات کو نقصان مجھی سے

یہ صرف شاعر کا ذاتی تجربہ نہیں ہے اگر ہم خود اپنے حالات کا جائزہ لیں تو ہمارے اکثر نقصانات کے ذمہ دار ہم خود ہی ٹھہریں گے۔یہ شعر کی وہ کیفیت ہے جسے آفاقیت سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا آغاز فردیت سے ہوتا ہے اور پھر یہ انفرادی تجربہ اجتماعی تجربہ بن جاتا ہے شکیلؔ ابن شرفؔ کے یہاں اکثر اشعار اِسی صفت کے حامل نظر آتے ہیں ؂

اب ہوا معلوم وہ آسودگی تو گھر میں تھی　　　　کھوج میں جس کے چلے آئے سمندر پار تک

وقت برگشتہ ہے لیکن یہ ضروری تو نہیں　　　　ہم بھی اوروں کی طرح شور مچانے لگ جائیں

اب کسی کی بے وفائی کا قلق ہوتا نہیں　　　　دھیرے دھیرے ہم کو جینے کا قرینہ آ گیا

جسے اِس دُنیا میں جینے کا قرینہ آ گیا اُس نے بازی مارلی یہی وجہ ہے کہ ناگفتہ بہ حالات میں بھی شکیلؔ ابن شرفؔ کے چہرے پر تبسم رقص کرتا رہتا ہے۔ مجھے اس تبسم میں کسی کے حسن کے جلوے بھی صاف نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں عشق کے بغیر شاعری میں حُسن پیدا نہیں ہوتا۔ یہ شعری حسن عشق کی مختلف کیفیات سے مشروط ہوتا ہے، کوئی محبوب کی کرم فرمائیوں سے راست متمتع ہوتا ہے تو کسی کا عشق دید و شنید تک ہی محدود ہوتا ہے اور کہیں یہ دِل ہی دِل میں پلتا ہے اور تاحیات محتاجِ اظہار رہتا ہے۔ شکیلؔ ابن شرفؔ کے یہاں لپک جھپک کی بجائے ایک شائستگی نظر آتی ہے جو اس بات کا اشاریہ ہے کہ وہ آداب عشق سے واقف ہے اور انہیں برتنے کا سلیقہ بھی جانتا ہے۔ اس کے یہاں حسن و عشق کی ایسی خوبصورت تصویریں ہیں جو نگاہ سے دِل میں اتر جاتی ہیں ؎

زندگی پوری توانائی سے لوٹ آتی ہے　　لمس اس شخص کے ہاتھوں کا طلسماتی ہے

محفوظ آج تک ہیں تمہاری نوازشیں　　ہم نے کسی بھی زخم کو بھرنے نہیں دیا

میری آنکھوں میں جاگتا ہے کوئی　　بے سبب رت جگا نہیں ہوتا

پڑھتا ہوں ترا خط تو مہک اُٹھتا ہے کمرہ　　معلوم نہیں کون سے خوشبو میں بسا ہے

عشق اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک کہ محبوب دُنیا کی ہر شئے سے زیادہ عزیز نہ ہو جائے اس منزل پر پہنچ کر اعتمادِ عشق فخر و ناز میں بدل جاتا ہے اور محبوب کو مثالی بنا دیتا ہے۔ شکیلؔ ابن شرفؔ کا یہ شعر اسی کیفیت کا غماز ہے ؎

چل گلستاں میں کہ شمشاد اکڑتا ہے بہت　　آج میں تجھ کو دِکھا کر اُسے مرعوب کروں

عاشق کی ایسی معصومانہ خواہشیں اور عجلت پسندی کبھی کبھی محبوب کی ناراضگی کا سبب بھی بن جاتی ہیں ؎

خفا وہ اس پہ ہے کہ وہ تو بام پر گیا نہیں　　مجھے یقینِ رویتِ ہلال کیسے آ گیا

اس خفگی پر قربان جائیے اس شعر میں نازِ حسن کے ساتھ عشق کی بے چارگی نے عجیب سے کیفیت پیدا کر دی ہے جسے اہلِ دِل ہی سمجھ سکتے ہیں۔ حسن کا یہی انداز عشق کو حوصلہ عرضِ طلب

عطا کرتا ہے اور منتظر ہے کہ ؎

دیکھئے ہوتا ہے کیا عرض طلب کا انجام　　　دِل ہے بے تاب اور اِدھر اور اُدھر سکتہ ہے

اس موضوع پر بے شمار اشعار ملتے ہیں لیکن یہاں صرف ایک لفظ ''سکتہ'' نے نہ صرف اس شعر کو شعر بنا دیا بلکہ ایک محاکاتی فضا بھی پیدا کر دی ہے جس کا تصور دِل و دماغ پر سحر کی طرح چھا جاتا ہے۔ عرض طلب پر عاشق کی اُمید و بیم میں مبتلا سوالیہ نشان بنی ہوئی صورت اور نفی و اثبات کی کشمکش میں حسن پر طاری سکتے کی کیفیت!! بس محسوس کرنے اور لطف اندوز ہونے سے تعلق رکھتی ہے اس وجدانی کیفیت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔

شکیلؔ ابن شرفؔ کی شاعری صرف شکایتِ دُنیا اور حسن و عشق کی کیفیات تک ہی محدود نہیں ہے وہ پختہ شعور اور سنجیدہ فکر کا حامل ایسا شاعر ہے جو ان سب سے پرے بھی بہت کچھ دیکھتا ہے اور جب وہ اس مقام سے شعر کہتا ہے تو موتی رولتا ہے اور ایسے ایسے گہرہائے آبدار پیش کرتا ہے جن کی تب و تاب صدیوں ماند نہیں پڑ سکتی ؎

مثل حباب بحر کہیں بے نشاں نہ ہو　　　کہہ دو زمیں زمیں ہی رہے آسماں نہ ہو

دیکھ میلہ نہ سمجھ جنگ کا میدان ہے یہ　　　اس میں دستاریں نہیں جاتی ہیں سر جاتے ہیں

یہ ہے دینِ حق کا معاملہ نہیں کوئی منطق و فلسفہ　　　جو حرام ہے سو حرام ہے جو حلال ہے سو حلال ہے

میں نہ کہتا تھا کہ گٹھری میں نہیں ہے کچھ بھی　　　جاؤ اب عیش کرو لوٹنے والو مجھ کو

عمر بھر اس کے لیے جان کھپاتے ہیں سبھی　　　یہ ضرورت ہے نہ تھکتی ہے نہ سُستاتی ہے

یوں ہی کرتا رہا جو من مانی　　　تجھ پہ کھل جائے گا خدا کیا ہے

ان اشعار کی لفظیات اور اسلوب اجنبی یا غیر مانوس نہیں ہیں لیکن اندازِ بیاں کی خوبی انہیں امتیاز عطا کرتی ہے۔ ہر شعر اپنی معنویت کے اعتبار سے ایک ایسی فضا تخلیق کرتا ہے جو قاری کی فکر کو مہمیز کرتی ہے۔ ان اشعار میں زمین و آسمان، میلہ، جنگ کا میدان، دستار، سر، منطق و فلسفہ ،حرام و حلال، گٹھری، ضرورت اور خدا علامات کی شکل میں ابھرتے ہیں اور قاری پر معنویت کی

ایسی پرتیں کھولتے ہیں کہ وہ سرورِ سرمدی سے سرشار ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اشعار شاعر کو درجۂ کمال تک پہنچاتے ہیں۔

ہر فنکار اپنی اور اپنے فن کی قدردانی کا خواہش مند ہوتا ہے لیکن یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا، اگر کچھ پذیرائی ہوتی بھی ہے تو وہ اس سے مطمئن نہیں ہوتا۔ غالبؔ کی خود اُن کے عہد میں کم پذیرائی نہیں ہوئی اس کے باوجود وہ زندگی بھر شکوہ سنج رہے ؎

جو چاہیئے نہیں ہے مِری قدر و منزلت

شکیلؔ بھی اپنی نا قدری کا شاقی ہے ؎

کر دیے جاتے نظر انداز ایسے تو نہ تھے ہم بھی بِک جاتے مگر پہنچے نہیں بازار تک

بازارِ مصر سے دھولیہ تک حسن و فن کا یہی حال ہے کبھی کم قیمت آنکی گئی اور کبھی بازار نصیب نہیں ہوا اور میرے خیال میں یہ نا قدری فنکار کے حق میں بہتر ہی ہے (اگر وہ واقعی فنکار ہے) کیوں کہ پھر وہ خود کو منوانے کے لیے دل و جگر لہو اور انگلیاں فگار کر لیتا ہے اور پھر انگلیوں سے روشنی ابلنے لگتی ہے جو اہلِ علم و ادب کے اذہان کو منور کر دیتی ہے۔ شکیلؔ ابن شرفؔ قدردانی کی اس منزل سے زیادہ دور نہیں ہے اس کی ابتدا ''بزمِ محبانِ شکیلؔ'' کے قیام سے ہو چکی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ شکیلؔ ابن شرفؔ کے فکر و فن کی یہ ''مہکار'' فضائے ادب کو معطر کر دے گی اور ادبِ عالیہ میں اپنی سرزمین کو وہ مقام عطا کرے گی جس پر اہلِ دھولیہ کو بجا طور پر ناز ہوگا۔

اشفاق انجم... یکم فروری ۱۲ء

''مہکار'' اور شکیل ابن شرف

ابراہیم اشک

اردو شاعری میں غزل کی روایت بہت پُرانی ہے۔ اِس کی ابتداء حضرت امیر خسرو سے ہوئی قلی قطب شاہ ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، میر تقی میر، سودا، استاد ابراہیم ذوق، غالب، داغ، اقبال اور فیض احمد فیض سے ہوتی ہوئی موجودہ دور کے شعراء تک پہنچی ہے۔ غزل ہی اردو زبان کا اعلیٰ سرمایہ ہے۔ یہ صنف سخن ہر قلم کار کی محبوب بن جاتی ہے۔ اُسے رجھاتی ہے، لبھاتی ہے اور اپنے گیسو سنوارنے کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔

میرے سامنے اس وقت شکیل ابن شرف کا شعری مجموعہ ''مہکار'' ہے۔ شکیل کے والد محترم محمد یحیٰی شرف بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ یوں دیکھا جائے تو شکیل ابن شرف کو شاعری وراثت میں مِلی ہے۔ شاعری دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک آمد کی شاعری جس میں الہامی کیفیت ہوتی ہے یا شانِ نزول پائی جاتی ہے۔ دوسری آورد کی شاعری جو علمی اور فنّی ریاضت سے کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کی شکیل ابن شرف آمد کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کو ہم اچھی اور سچی شاعری کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اِلٰہی بخش دینا مجھ کو نعتوں کے حوالے سے
جو میرے نامۂ اعمال میں کوئی کمی آئے

تنہائی بھی وہ رنگ دکھاتی ہے کہ اکثر
محسوس یہ ہوتا ہے کوئی بول رہا ہے

اے زبانِ میر و غالب اے غزل کی آبرو
وقف کر دی ہم نے اپنی زندگی تیرے لیے

اوڑھ لی آسمان کی چادر
ہم نے فٹ پاتھ کو بچھونا کیا

درمیاں اپنی انا کو نہیں آنے دیتے
میں چلا جاتا ہوں جب بھی وہ بلاتا ہے مجھے

ان پانچ اشعار پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ شاعر دین و ایمان والا ہے جو اپنے گناہوں کی بخشش نعتوں کے حوالے سے کروانے کی آرزو رکھتا ہے۔ اس نے میر و غالب کی زبان یعنی اردو کی آبرو بچانے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی

ہے۔اس کی وجدان کی کیفیت کا یہ عالم ہے کہ تنہائی میں بھی اسے کوئی بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔اس کی قلندری ایسی ہے کہ فٹ پاتھ پر بچھونا کر کے آسمان کو اوڑھ لیتا ہے۔محبوب سے محبت کا یہ عالم ہے کہ درمیاں کبھی بھی اپنی انا کو نہیں آنے دیتا۔ان اشعار میں شاعر کا کردار پوری طرح اجاگر دِکھائی دیتا ہے۔شکیلؔ ابن شرفؔ ایک اچھے اور سچے کردار کے پاسدار ہیں ان کے اندر اور باہر انسانی قدروں کا ایک ایسا ماحول نظر آتا ہے جو ایک اچھے سماج کو ترتیب دیتا ہے۔ان کے چند اشعار اور ملاحظہ کریں ؂

چھیڑ کر قصّہ کوئی بچوں کو بہلا لیں گے ہم　　جب کھلونے بیچنے والا گلی میں آئے گا

بساطِ وقت پہ مہرے بدلتے رہتے ہیں　　ہم آپ خود نہیں چلتے چلا رہا ہے کوئی

ہم بزرگوں کی روش چھوڑ کے پچھتائے شکیلؔ　　بچ کے نکلے جو کنوئیں سے تو گرے کھائی میں

تو مِرے ٹوٹے ہوئے گھر کو حقارت سے نہ دیکھ　　ایک دِن تیری حویلی بھی کھنڈر ہو جائے گی

شکیلؔ ابن شرفؔ کے یہ اشعار اس بات کی صاف طور پر گواہی دے رہے ہیں کہ وہ نیا مضمون باندھیں یا پُرانا،شعریت کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور یہی ایک اچھے اور ہنر مند شاعر کی پہچان ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے ہنر کو اپنے اندازِ بیان کو طلسمی بنا دیتا ہے۔

غزل کی راہ کے مسافر تو بہت سے ہیں ''جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے''لیکن مبارکباد کے قابل ہیں وہ لوگ جو اچھا شعر کہنے کی مسلسل سعی کرتے رہتے ہیں اور شکیلؔ ابن شرفؔ انہیں مسافروں میں سے ایک ہیں۔ان کے یہاں صاف ستھری زبان بھی ہے اور اندازِ بیاں کا سلیقہ بھی،فکر و خیال کی نفاست بھی ہے اور معنی و مفہوم کی بلاغت بھی۔

غزل کے ایسے کئی سفیر ہر عہد میں گمنامی کے گوشے میں پڑے رہتے ہیں ان کا سرمایہ ان کے ساتھ ہی دفن ہو کر رہ جاتا ہے اور علم و ادب کا حصہ نہیں بن پاتا۔شکیلؔ ابن شرفؔ کا یہ سرمایہ منظر عام پر آرہا ہے۔اس کے لیے میں انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ وہ علم و ادب کا حصّہ بن رہا ہے۔آخر میں ان کا یہ شعر ؂

کب مجھ کو اپنے کام کی اُجرت نہیں مِلی　　کب میری دسترس میں خزانہ نہیں رہا

ایک تاثر

بشر نوآز

شکیلؔ ابن شرفؔ اپنے نجی تجربے کو شعر بنانے کا ہُنر جانتے ہیں۔ بظاہر یہ سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں اِتنی سادہ نہیں۔ ہر فرد کا تجربہ دوسرے سے کسی نہ کسی حد تک الگ ہوتا ہے۔ وہ اپنے تجربے کو اپنے طور سے قبول کرتا ہے۔ اِسی لیے اس کا اظہار بھی کچھ الگ وسائل چاہتا ہے۔ غزل جیسی صنف سخن میں جس کی روایت تقریباً پانچ ساڑھے پانچ سو سال پر محیط ہے۔ اپنے ذاتی تجربے کو اپنے انداز میں پیش کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔

میں جب شکیلؔ کو نجی تجربے کا شاعر کہتا ہوں تو میری مراد اُن اشعار سے ہوتی ہے جن کا تعلق ایک عام آدمی کی زندگی میں تقریباً روز ہی پیش آنے والے معاملات سے ہوتا ہے۔ عام طور پر ہم ان واقعات اور تجربات کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ معمولی پن میں بھی تجربے کی صداقت اور شاعر کا خلوص غیر معمولی پن پیدا کر دیتا ہے۔ شکیلؔ ابن شرفؔ کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں ؎

کیوں نہ ہم شرم سے منہ اپنا چھپانے لگ جائیں　　سارے احباب جب احسان جتانے لگ جائیں

مفلسی نے ہمیں اِس حال کو پہنچایا ہے　　چاک دامانی سے اندازۂ وحشت نہ کرو

دیکھ کر عزیزوں کی خوش گمانیاں ہم نے　　بند کر لیا خود کو مصلحت کے تالوں میں

غزل ایسی صنف سخن ہے جس میں کچھ شعر تو شاعر کہتا ہے اور کچھ شعر روایت کہلواتی ہے۔ روایت کے کہلوائے ہوئے شعر میں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ شاعر نے روایت کو کیسے انگیز کیا اس کے کس پہلو کو اجاگر کیا اور اُسے اپنی ذات سے کس حد تک ہم آہنگ کیا؟ اس نقطۂ نظر سے جب شکیلؔ ابن شرفؔ کے اشعار کو دیکھتے ہیں تو یہ خوشگوار احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے بڑی چابکدستی اور فنکارانہ شعور کے ساتھ ''پر بیتی'' کو قریب قریب آپ بیتی بنا لیا ہے ؎

اُس کو آنے پر کوئی مجبور کر سکتا نہیں　　آئے گا بے شک مگر جب اُس کے جی میں آئے گا

مسکرا کر اس نے میرا حال جب پوچھا شکیلؔ   شدتِ جذبات سے دِل کا عجب عالم ہوا

"مہکار" میں یہ اور ایسے کئی اشعار مِل جائیں گے جن میں عمومی عشقیہ تجربات کی بازیافت کی گئی ہے لیکن اس نوع کے اشعار بھی زبان کی صفائی، مصرعوں کی برجستگی، سادگی کی وجہ سے دِل کو چھوتے ہیں۔

شکیلؔ ابن شرفؔ تربیت یافتہ ذہن اور سدھے ہوئے ذوق کے مالک ہیں۔ان کے اشعار میں شائستگی، متانت اور ضبط کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔خوشی ہو یا غم، غصہ ہو یا محبت وہ اپنی وضع پر قائم رہتے ہیں اور بڑے ہموار لہجے میں اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔یہاں میں اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر کچھ اشعار پیش کروں گا۔کچھ اشعار روزمرہ کے تجربات کے سلسلے میں ؎

واقف ہے مِرے حال سے وہ مجھ سے زیادہ   چہرے سے تو لگتا ہے کہ بستی میں نیا ہے

تنگ نظری کی بدولت آج یہ عالم ہوا   ایک نے پائی خوشی تو دوسرے کو غم ہوا

مجھ کو گرا نہ پاؤ گے تم سیندھ لگا کر   وہ چھت ہوں جو منت کشِ دیوار نہیں ہے

اور کچھ شعر واردات دل کے بارے میں ؎

جھیل کے اس پار پیڑوں پر ابھی تک نقش ہیں   میں نے جو پیغام لکھے تھے کبھی تیرے لیے

ہوگئیں خشک منتظر آنکھیں   اب یہ چشمے کہاں ابلتے ہیں

آ بھی جا لوٹ کے او روٹھ کے جانے والے   راستہ دیکھ رہے ہیں در و دیوار تِرا

یہ اشعار بنا کسی کاوش کے "مہکار" کے ابتدائی صفحات پر نظر آگئے سو نقل کر دیئے ورنہ ایسے بلکہ ان سے بھی بہتر اشعار پورے مجموعے میں مِل جائیں گے۔کسی مجموعہ میں ایک سطح اور ایک مزاج کے اتنے اشعار کا ملنا معمولی بات نہیں ہے۔

میں اتنے اچھے اور سلجھے ہوئے اشعار کے خالق شکیلؔ ابن شرفؔ کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے ایک عمدہ کتاب سے لطف اٹھانے کا موقع فراہم کیا۔

بشر نواز...اورنگ آباد   ۱۷/اپریل ۲۰۰۹ء

غزل کا جادو سر چڑھ کر بولتا ھے

از پروفیسر عبدالوہاب جذبؔ

زندگی بوقلموں جلوہ بساطِ ارژنگ

عبدالعزیز خالد نے زندگی کو چینی مصور ارژنگ کی بساط رنگ سے تعبیر کیا ہے۔ میں اس استعارے کو غزل پر محیط کرتا ہوں۔ غزل کو جہاں سکندر علی وجدؔ نے اردو شاعری کی آبرو کہا ہے وہیں اردو کے مشہور نقاد کلیم الدین احمد نے اس پر وحشی صنف سخن کی پھبتی کسی ہے۔ شاید اس لیے کہ دو دو مصرعوں میں الگ الگ مختلف النوع مضامین باندھے جاتے ہیں۔ اس میں نظم کا سا ارتباط نہیں البتہ غزل مسلسل میں یہ بات پائی جاتی ہے جس کی سب سے اعلیٰ مثال مومنؔ کی وہ غزل ہے جس کی ردیف ہے ؎ ''تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو''

غزل اردو میں عربی اور فارسی سے آئی ہے۔ فارسی میں غزل کی روایت بہت قدیم اور توانا ہے دو مصرعوں میں ایک وسیع طویل وعریض حقیقت کو سمودینا گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دینے کے مترادف ہے۔ اردو کی عمر ہی کتنی ہے؟ لیکن اتنے کم عرصے میں غزل نے گویا پیچھے سے آکر فارسی غزل کو جالیا ہے۔ میرؔ وسوداؔ، غالبؔ ومومنؔ، انشاءؔ و مصحفیؔ اور بعد کے دور میں اقبالؔ، جگرؔ، اصغرؔ، فیضؔ ، جوشؔ، اثرؔ لکھنوی، فراقؔ، حسرتؔ سے لے کر خمارؔ مجروحؔ اور ہمارے دور کے سب سے مقبول شاعر احمد فرازؔ تک غزل نے جو مقبولیت حاصل کی ہے وہ کسی دوسری صنف سخن کے حصے میں نہیں آئی۔

شکیل ابن شرفؔ دھولیہ کے ایک کہنہ مشق استاد شاعر ہیں۔ اپنے اوّلین مجموعۂ کلام ''خوشبو کا بدن'' ہی سے اوج ثریا کی طرف گامزن ہو گئے اور بیکل اتساہی جیسے غزل اور گیت کے جانے مانے شاعر سے بھرپور داد وتحسین حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے جب کہ بیکل داد دینے میں ذرا کنجوس ہیں اور بخل سے کام لیتے ہیں۔ اُسی مجموعے کے چند چونکا دینے والے اشعار سنیے اور شکیلؔ ابن شرفؔ کی انفرادیت پر سر دھُنیئے ؎

آسماں کا نہیں بگڑتا کچھ　　　چند تاروں کے ٹوٹ جانے سے

ذکر میرا چھیڑ کر تم اس کا چہرہ دیکھنا ایک سایہ آئے گا اور ایک سایہ جائے گا

ایک سایہ آئے گا اور ایک سایہ جائے گا سے جو امیج بنتا ہے اس کا جواب نہیں یہ امیج بھی ملاحظہ کیجئے ؎

کچھ دائرے پانی پہ مجھے ڈھونڈ رہے تھے میں جھیل میں پھینکے ہوئے پتھر کی طرح تھا

شاعری کا کمال یہی ہے کہ پیش پا افتادہ مضامین سے نئے اور فریش امیج تراشے اور ان کو اپنی جاگیر بنا لے اور اپنی انفرادیت کا سکہ جمائے۔

''خوشبو کا بدن'' سے ''مہکار'' کا فاصلہ گویا آسمان تک اڑان کے مترادف ہے۔

ایک شعر دیکھ کر پھر غالبؔ یاد آجاتا ہے۔ غالبؔ نے کہا تھا ؎

تِرے وعدے پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

اور شکیلؔ ابن شرفؔ اسی بات کو ایک نرالے ڈھنگ سے یوں کہتے ہیں ؎

تِرے وعدے پہ بھروسہ تو میں کرلوں لیکن تِرے لہجے سے عیاں ہوتا ہے انکار تِرا

اسلوب احمد انصاری کے الفاظ میں غالبؔ کا تحمل تو کسی اور جگہ ملنا مشکل ہے لیکن شکیلؔ ابن شرفؔ نے لگی لپٹی بات نہیں کی بلکہ صاف کہہ دیا ؎ تِرے لہجے سے عیاں ہوتا ہے انکار تِرا

غزل میں بقول غالبؔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دِل میں ہے

اس تناظر میں شکیلؔ ابن شرفؔ کے یہ دو مطلع یکے بعد دیگرے گویا ہمارے اپنے حالات کا مرقع کھینچ رہے ہیں ؎

تنگ نظری کی بدولت آج یہ عالم ہوا ایک نے پائی خوشی تو دوسرے کو غم ہوا

کھل گئیں آنکھیں مزاجِ وقت جب برہم ہوا دیکھتے ہی دیکھے یاروں کا حلقہ کم ہوا

دُنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو صرف خود ہی کو نمایاں دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسرے کو ابھرنے نہیں دینا چاہتے ؎

وہ چاہتا تھا شہر میں تنہا دکھائی دے　　اُس نے کبھی کسی کو ابھرنے نہیں دیا

آوارہ پنچھیوں کا ٹھکانہ نہیں رہا　　آنگن میں اِک درخت پُرانا نہیں رہا

یہ ایک شعر کئی باتیں کہہ گیا کیوں کہ غزل کا کمال اس کی رمزیت اور اشاریت ہے ایک بزرگ شخص کے نہ رہنے سے اب دور دراز کے اجنبی رشتے داروں کے آنے کا راستہ بھی گویا بند ہو گیا یعنی کئی پرتیں ان دو مصرعوں سے کھلتی ہیں یا یہ تلخ حقیقت غزل کی زبانی سنیئے ؎

جو لوگ اُڑ رہے تھے بہت آسمان پر　　ان کا زمین پر بھی ٹھکانہ نہیں رہا

لازم ہے کہ زمین پر انسان کے قدم جمیں اور گڑے رہیں ورنہ وہ کہیں کا نہیں رہے گا۔

غزل بنیادی طور پر معاملہ بندی اور عشقیہ مضامین سے تعلق رکھتی ہے کیوں کہ غزل کے معنی ہی معشوق سے بات کرنا ہے۔ خالص تغزل کے اشعار بھی مہکار میں مہک اٹھتے ہیں گو ''کم کم ہی سہی نسبتِ پیمانہ رہی ہے''۔ یہ شعر پڑھیئے اور سر دھُنیئے ؎

سارے جگ سے نام چھپایا میں نے جس ہرجائی کا　　ہنس ہنس کر وہ پوچھ رہا ہے حال مِری رسوائی کا

تِرے بغیر ہے منظر اُداس اُداس بہت　　بہار ہو کہ خجل گلستاں سے گزری ہے

غرض شکیلؔ ابن شرفؔ نے غزل کا وہ جادو جگایا ہے کہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ کچھ چونکا دینے والے اشعار اور ملاحظہ فرمائیے ؎

بساطِ وقت پہ مہرے بدلتے رہتے ہیں　　ہم آپ خود نہیں چلتے چلا رہا ہے کوئی

اختلاف اپنی جگہ عرضِ ہنر اپنی جگہ　　تِرا دُشمن تری تعریف بھی کر سکتا ہے

آج شہرت تجھے حاصل ہے تو اترا نہ شکیلؔ　　یہ پرندہ مِری چھت پر بھی اتر سکتا ہے

کیسے کہوں جاتے ہوئے اُس نے مجھے روکا نہیں　　میں وقت کے ہمراہ تھا اس واسطے ٹھہرا نہیں

نمونہ مشتے از خروارے کے مصداق سمندر سے کچھ موتی میں نے رولے ہیں ویسے بھی ہر ایک کی پسند الگ ہوتی ہے۔ ہر غواص، شعر و سخن کے اس بحر ناپیدا کنار سے الگ الگ موتی نکال لائے گا۔

جو تجھ سے کی ترِے لہجہ میں گفتگو میں نے

شکیلؔ ابن شرفؔ

رؤف صادق

جدیدیت نے کسی صنف کو کیا دیا کیا نہ دیا۔اس بحث سے قطع نظر عرض کرتا چلوں کہ جدیدیت نے غزل کو ایک سرسبز وشاداب وسیع میدان ضرور عطا کیا۔غزل نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور پھر سے پُرشباب ہوگئی۔اس کے حسن میں نکھار آ گیا۔حالات حاضرہ کے کرب واحساسات اور موضوعات کے گہنوں نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیئے۔

غزل نے روایتی اور قدیم انداز فکر سے صرف نظر کر کے نئے اسلوب، نئے لہجے، تمثلیوں، استعاروں سے اپنی شناخت کی نئ طنابیں زمین پر کھینچ دیں۔اس طرح غزل نے پھر ایک بار اپنی حیثیت منوالی ہے جس کو ترقی پسند تحریک نے نظر انداز کر دیا تھا۔

غزل کا فن، اختصار لفظی، وسعت معنی اور شعری سطح پر احساسات کا منبع ہے۔غزل ہمیشہ فطرت شعری کے مطابق لفظوں کو قبول کرتی ہے۔جو اس کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہوتے انھیں درگزر کر دیتی ہے۔اسی لیے کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنف قرار دیا ہے۔اس کے باوجود بھی غزل کا سحر سر چڑھ کر بولتا رہا۔بولتا رہے گا۔

غزل کا فن ایک نفیس ولطیف فن ہے۔شاعر جب اُس کی گہرائی میں اترتا ہے تو بس اترتا چلا جاتا ہے۔یعنی زندگی کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زن ہو کر نایاب گوہر ہاتھ لگتا ہے تو وہ شعر کا رُوپ دھارن کرلیتا ہے۔جو کبھی جگنو کی طرح، کبھی ستارے کی طرح کبھی شمس وقمر کی طرح دِل کی کائنات کو منور کر دیتا ہے گویا زندگی کے تمام گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔انسانیت کے میناروں سے روشنی پھوٹنے لگتی ہے، درد و الم، رنج و الم، پیار محبت، خلوص، ہمدردی، رشتے ناتے سب کچھ تمثیل اور استعارے بن جاتے ہیں، اشارے کنائے بن جاتے ہیں، علامت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، فلسفے سیڑھیوں سے اتر کر انسانیت کے در پر سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔یہاں شاعر کی لگن، شاعر کی فکر شعر کی

صورت میں دِلوں میں اپنا گھر بنا لیتی ہے اور وہ شعری آئینہ گری اپنے عہد اپنے سماج کی ایک تاریخی دستاویز بن جاتی ہے۔ جو دِلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ کے مصداق ایک اچھے شعر کی یہی خوبی ہوتی ہے یہی حقیقت بھی۔ ایک کمہار برتن بنانے سے قبل مٹّی کا انتخاب کرتا ہے، چھان پھٹک کرتا ہے اس میں کیمیائی اجزاء ملاتا ہے۔ پھر گوندھتا ہے اس میں لوچ پیدا کرتا ہے جب اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ مٹی اب برتن بنانے کے قابل ہو چکی ہے تو چاک پر رکھ دیتا ہے پھر اس کی انگلیاں ہنر مندی سے تخلیقی کام میں جٹ جاتی ہیں اور ایک خوبصورت صراحی وجود میں آتی ہے۔ پھر اس پر نقش و نگار، گل بوٹے اس کے ظاہری حسن میں اور حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی کیفیت شکیلؔ ابن شرفؔ کے شعروں میں پائی جاتی ہے ؎

کون اپنا تھا غم و رنج و مصائب کے سوا　　　انہیں احباب نے مِل جُل کے سنبھالا ہم کو

یہ شعر اس مضمون کو درشاتا ہے کہ اپنا یہاں کوئی نہیں ہے سوائے غم و رنج و مصائب کے جو ہمارے احباب ہیں ہمارے رفیق ہیں ہمارے جینے کا بڑا سہارا ہیں اس شعر میں لفظ ''احباب'' ایک خوبصورت نقطے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس شعر میں شعری نزاکت ہے اس وقت مجھے غالبؔ کا یہ شعر یاد آ رہا ہے ؎

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ　　　ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

غالبؔ نے سبزے کے اس استعارے کو سحر انگیز معنی دیئے ہیں۔ جو خوبصورت پیکر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور خزا کے مفہوم کو بہار کے معنوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ شکیلؔ ابن شرفؔ کے مجموعۂ کلام میں جا بجا تمثیلیں، تشبیہات اور استعارے اپنے وجود کا احساس دِلاتے رہتے ہیں۔ شکیلؔ ابن شرفؔ کی شاعری انہیں اجزاء سے تشکیل پاتی ہے۔ اسی بنیاد پر وہ شعر کی خوبصورت عمارت کھڑی کرتے ہیں جس پر احساسات کا روغن چڑھا ہوتا ہے۔ صاف ستھری خیالبندی، غنائیت، لہجہ جیسے پھول کی پنکھڑیوں پر شبنم گر رہی ہو۔ محبوب سے مخاطبت، غزل کی تہذیب اور روایت کی یاد تازہ کرتی ہے۔ شکیلؔ ابن شرفؔ اس معاملے میں خوش قسمت ہیں کہ انہیں محبوب شریف النفس مِلا۔

مِری آواز جو پڑ جاتی ہے کانوں میں شکیلؔ　　　وہ چلے آتے ہیں بے ساختہ انگنائی میں

دِل کو اب چین ہی نہیں ملتا　　　تیری آنکھوں نے کہہ دیا کیا ہے

فن تجرید بھی ایک فن ہے اس میں استعاروں، علامتوں کی مدد سے کسی خیال کی پیکر سازی کی جاتی ہے اور مکمل خدوخال کے ساتھ کئی مختلف زاویوں سے خیال کی تشکیل و تجسیم بھی ہوتی ہے۔ جیسے فن سنگ تراشی میں مصر کے ابوالہول کا تاریخی مجسمہ جس کا نصف حصہ شیر کا اور نصف حصہ عورت کا۔ جس سے یہ استعارہ اخذ کیا گیا ہے کہ عورت شیر کی طرح طاقت ور ہوتی ہے ضد پر آجائے تو پھاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ جدید مصوری میں اس فن کو ایسٹریکٹ اِزم بھی کہتے ہیں۔

غالبؔ کا مجموعہ کلام اسی مجرد شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخئی تحریر کا　　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اس شعر پر مختلف ناقدین اور تجزیہ نگاروں نے اپنی اپنی آراء اور تشریحات پیش کی ہیں۔ ہم ان کی تشریحات کو یکسر نظرانداز نہیں کر سکتے کیوں کہ یہ خیال مختلف جہتوں سے گزرتا ہوا مختلف معنی و مفہوم کے تناظر میں وسعت اختیار کر لیتا ہے۔ شکیلؔ ابن شرفؔ کے فکری نظام اور شعری اسٹرکچر میں عام فہم لفظوں کا استعمال ان کو سامعین کے دلوں تک پہنچاتا ہے۔ اِسی لیے وہ بھاری بھرکم علامتی نظام سے گریز کرتے ہوئے تمثیلی پیرائے اختیار کرتے ہیں ؎

آوارہ پنچھیوں کا ٹھکانہ نہیں رہا　　　آنگن میں اِک درخت پُرانا نہیں رہا

کوئی تمثیل نہیں اس کی جولائے کوئی　　　کیسے آئینے کو آئینہ دکھائے کوئی

زندگی کو برتنے کی طاقت نہیں　　　خوف آتا ہے آبِ بقا دیکھ کر

شکیلؔ ابن شرفؔ کا فکری نظام سماج کے پس منظر سے ہوتا ہوا احساس کی اتھاہ گہرائیوں میں پھیل جاتا ہے جہاں پر رشتے ناطوں کے چہرے، عزیز و اقارب اور اطراف میں پھیلے ہوئے ان گنت لوگوں کے نفسیاتی خدوخال شعر کے سانچے میں ڈھل کر آئینہ بن جاتے ہیں ؎

وہ دیکھنے لگا ہے مجھ کو شک بھری نگاہ سے　　　میں سوچتا ہوں آئینے میں بال کیسے آ گیا

جوش میں آ کے سمندر کا اڑاتے ہیں مذاق   سوکھے تالاب جو برسات میں بھر جاتے ہیں

کھل گئیں آنکھیں مزاج وقت جب برہم ہوا   دیکھتے ہی دیکھتے یاروں کا حلقہ کم ہوا

شکیلؔ ابن شرفؔ کی شاعری روایتی اور جدت طرازی کا ایک حسین امتزاج ہے۔

ان کے یہاں جمالی حسیت ان کی شاعری کا احاطہ کرتی ہوئی لطافت اور سحر انگیزی پیدا کر کے شعر کو خوبصورتی عطا کرتی ہے۔ان کے پاس لفظوں کو برتنے کا سلیقہ ہے۔ وہ روح معانی سے اچھی طرح واقف ہیں۔غیر مستعمل لفظوں سے گریز کرتے ہیں۔ان کی زبان عام فہم رواں دواں ہوتی ہے۔ وہ شعر میں خود سے مخاطب ہوتے ہیں،محبوب سے مخاطب ہوتے ہیں،عزیز و اقارب سے، اطراف واکناف کے لوگوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان کی گفتگو میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو ان کا مجموعہ کلام ضرور پڑھیے۔

رؤف صادق

11/10 ،گیٹ نمبر 5

او. سی. سی.، مالونی ملاڈ (ویسٹ)

ممبئی 400095

سیل نمبر 9220704944

خدایا دسترس دے مجھ کو الفاظ و معانی پر
طبیعت دم بدم اُکسا رہی ہے نعت خوانی پر

مِرے آقاؐ کا ہر انداز دُنیا سے نِرالا ہے
دُعائیں کون دیتا ہے بھلا ایذا رسانی پر

جو ہلتے تھے مِرے آقاؐ کے لب تو پھول جھڑتے تھے
فرشتے سر دھُنا کرتے تھے اُن کی خوش بیانی پر

بنا دے اے خدا مجھ کو کبوتر ان کے روضے کا
کبھی دالان میں اتروں کبھی بیٹھوں کمانی پر

مِری فکرِ رسا نعتِ نبیؐ میں مست رہتی ہے
نہ کیوں اتراؤں میں اپنی طبیعت کی روانی پر

زباں کیا حق ادا کرتی شکیلؔ ان کی عنایت کا
معین کر دیا اشکوں کو دِل کی ترجمانی پر

بشارت دی تھی جِن کی ہر نبی نے وہ نبیؐ آئے
پیامِ کبریا لے کر رسولِ ھاشمیؐ آئے

ہمارا ہی نہیں بلکہ خدا کا بھی وہ پیارا ہے
نہ کیوں رحمت درودوں کے حوالے سے چلی آئے

اِلٰہی بخش دینا مجھ کو نعتوں کے وسیلے سے
جو میرے نامۂ اعمال میں کوئی کمی آئے

مجھے دھڑکا لگا رہتا ہے اپنی نارسائی کا
درِ سرکارؐ تک پہنچوں تو میرے جی میں جی آئے

سُنا ہے اُن کی خوشبو آج بھی محسوس ہوتی ہے
مِرے حصّے میں بھی یارب مدینے کی گلی آئے

جب آئیں گے غلام اُن کے تو شور اُٹھّے گا محشر میں
وہ دیکھو جنّتی آئے وہ دیکھو جنّتی آئے

مِرے پیشِ نظر ہو جب نظارہ سبز گنبد کا
شکیلؔ ایسا نہ ہو ایسے میں آنکھوں میں نمی آئے

سچّائی بیاں کرتا ہوں یہ میری خطا ہے
احباب کو مجھ سے جو شکایت ہے بجا ہے

آئینہ لئے شہر میں وہ گھوم رہا ہے
اندھا ہے مگر راہ نمائی پہ تُلا ہے

ہم وہ تو نہیں ہیں کہ مُکر جائیں گے کہہ کر
دُہرائیں گے سو بار کہا ہے تو کہا ہے

واقف ہے مِرے حال سے وہ مجھ سے زیادہ
چہرے سے تو لگتا ہے کہ بستی میں نیا ہے

جب پڑھتا ہوں اس خط کو مہک اُٹھتا ہے کمرہ
معلوم نہیں کون سی خوشبو میں بسا ہے

کیوں سامنے پا کر مجھے اِس درجہ خجل ہو
جو تم نے کہا ہے وہ کہاں میں نے سُنا ہے

تنہائی بھی وہ رنگ دِکھاتی ہے کہ اکثر
محسوس یہ ہوتا ہے کوئی بول رہا ہے

یہ خاص تعارف ہے شکیلؔ ابنِ شرفؔ کا
چھوٹوں میں وہ چھوٹا ہے بڑوں میں وہ بڑا ہے

○

چل پڑے کچھ اور کچھ چلنے کی تیّاری میں ہیں
سوچنے والے ابھی تک چار دیواری میں ہیں

اپنے بارے میں بھی سوچیں گے اگر فرصت مِلی
ہم ابھی تو دوستو ں کی ناز برداری میں ہیں

شرم کے مارے اِدھر ہم منہ چھپاتے ہیں شکیلؔ
اور ادھر احباب اپنی اپنی ہُشیاری میں ہیں

جِس طرح ہم نے گذاری زندگی تیرے لئے
اِس طرح رُسوا نہیں ہوگا کوئی تیرے لئے

تو نہ ہوتا تو یہ رُسوائی کِسے منظور تھی
سہہ رہا ہوں دوستوں کی دُشمنی تیرے لئے

جھیل کے اُس پار پیڑوں پر ابھی تک نقش ہیں
میں نے جو پیغام لکھّے تھے کبھی تیرے لئے

وقت بدلا ہے مگر چاہت نہیں بدلی مِری
دِل کا دروازہ کھُلا ہے آج بھی تیرے لئے

ہو گیا دُنیا کی نظروں میں مقدّس وہ مقام
میں جہاں ٹھہرا تھا آ کر دو گھڑی تیرے لئے

دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے تالی دھیان رکھ
تو کبھی میرے لئے ہو میں کبھی تیرے لئے

دھیان تو اپنے رویّے پر نہیں دے گا اگر
دوست ہو جائیں گے اِک دِن اجنبی تیرے لئے

اے زبانِ میؔر و غالبؔ اے غزل کی آبرو
وقف کردی ہم نے اپنی زندگی تیرے لئے

نام خوشحالوں میں شامِل ہو گیا میرا شکیلؔ
میں نے ہونٹوں پر سجائی تھی ہنسی تیرے لئے

○

بن کے ہمراز وہ رنجش کو ہوا دیتا ہے
ایک سنتا ہے تو دس جا کے لگا دیتا ہے

آج کل وہ بہت اُچھلتے ہیں
لے کے بیساکھیاں جو چلتے ہیں

لوگ تو چال خوب چلتے ہیں
ہم مگر ہیں کہ بچ نکلتے ہیں

جو ہمیشہ سنبھل کے چلتے ہیں
گِرتے گِرتے وہی سنبھلتے ہیں

ہوگئیں خشک منتظر آنکھیں
اب یہ چشمے کہاں اُبلتے ہیں

خاک کا رِزق سب کو ہونا ہے
لوگ پِھر بھی اکڑ کے چلتے ہیں

نہیں آتی منافقت ہم کو
اِس لئے ہر کسی کو کھلتے ہیں

کل جو تھے میرے درپئے آزار
اب مِرے نام سے دہلتے ہیں

معرکہ گرم ہے اَنا کا شکیلؔ
جِسم گرتے ہیں سر اُچھلتے ہیں

تو اکیلا کہاں پھرے گا شکیلؔ
چل تِرے ساتھ ہم بھی چلتے ہیں

○

دو پیسہ جس وقت کمانے لگتا ہے
باپ کو بیٹا آنکھ دِکھانے لگتا ہے

تنگ نظری کی بدولت آج یہ عالم ہوا
ایک نے پائی خوشی تو دوسرے کو غم ہوا

کھل گئیں آنکھیں مزاجِ وقت جب برہم ہوا
دیکھتے ہی دیکھتے یاروں کا حلقہ کم ہوا

دور سے ہم بھی بہت اچھا سمجھتے تھے اُسے
اصلیت اُس کی کھلی تب فاصلہ جب کم ہوا

مُسکرا کر اُس نے میرا حال جب پوچھا شکیلؔ
شدّتِ جذبات سے دِل کا عجب عالم ہوا

آپس میں اختلاف اُبھرنے نہیں دِیا
اپنا قبیلہ ہم نے بکھرنے نہیں دیا

آنکھوں میں کوئی خواب اُترنے نہیں دیا
غربت نے بیٹیوں کو سنورنے نہیں دیا

کچھ لوگ ساری عمر دکھاتے رہے ہنر
لیکن کوئی مقام ہنر نے نہیں دیا

وہ چاہتا تھا شہر میں تنہا دکھائی دے
اس نے کبھی کسی کو ابھرنے نہیں دیا

مجھ سے زیادہ رہتا ہے اس کو مرا خیال
اس نے مرے یقین کو مرنے نہیں دیا

محفوظ آج تک ہیں تمہاری نوازشیں
ہم نے کسی بھی زخم کو بھرنے نہیں دیا

آغوش میں سمیٹ کے بیٹھی رہی شکیلؔ
بچوں کو بوڑھی ماں نے ٹھٹھرنے نہیں دیا

کب کہا میں نے کہ تم سر پہ بٹھالو مجھ کو
مِل نہ جاؤں کہیں مِٹّی میں سنبھالو مجھ کو

"آدمیّت ہوں میں محبوس ہوں دیواروں میں
آؤ تہذیب کے جنگل سے نکالو مجھ کو

میں نہ کہتا تھا کہ گٹھری میں نہیں ہے کچھ بھی
جاؤ اب عیش کرو لوٹنے والو مجھ کو

عمر کہتی ہے کہ اب فرصت نظّارہ نہیں
رُت یہ کہتی ہے کہ آنکھوں میں بسالو مجھ کو

کئی سورج مرے سائے سے جلا پاتے ہیں
کیا اندھیروں سے ڈراتے ہو اجالو مجھ کو

پھر بتاؤں گا کہ مرلی میں ہیں تانیں کتنی
اپنی رادھا سے تو ملنے دو گوالو مجھ کو

کام آؤں گا تمہارے میں برے وقتوں میں
کہہ کے آوارہ نہ بستی سے نکالو مجھ کو

سخت مشکل تھا ، جس کا ہونا ، کیا
لفظ مٹّی تھے میں نے سونا کیا

گردشِ وقت دائروں میں رہی
ہم نے احساس کو تکونا کیا

اوڑھ لی آسمان کی چادر !
ہم نے فٹ پاتھ کو بچھونا کیا

خواب مٹّی میں مِل گئے سارے
اس نے دل کو مرے کھلونا کیا

اس کا ملنا محال تھا ، سو ، رہا
ہم نے بیکار رونا دھونا کیا

پھر کبھی ہوش میں ہم آ نہ سکے !
مست آنکھوں نے ایسا ٹونا کیا

وہ نہیں آیا ہم نے سو سو بار
صاف کمرے کا کونا کونا کیا

گل کو شرمندہ کروں چاند کو محجوب کروں
اِک غزل اور ترے نام سے منسوب کروں

چل گلستاں میں کہ شمشاد اکڑتا ہے بہت
آج میں تجھ کو دکھا کر اسے مرعوب کروں

اپنی قسمت پہ بھروسہ ہی نہیں ہے مجھ کو
صبر کس طرح بھلا صورتِ ایوبؑ کروں

اک سمجھدار کو ہوتا ہے اشارہ کافی
کب تلک تذکرۂ گریۂ یعقوبؑ کروں

آئینہ ہاتھ میں ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں
بیٹھ کر میں بھی بہت خوب بہت خوب کروں

خونِ دل خونِ جگر خونِ تمّنا کے سوا
زندگی پیش تجھے کون سا مشروب کروں

لوگ جوڑیں نہ کہیں میرا تعلق تجھ سے
کیا بیاں کشمکشِ طالب و مطلوب کروں

حوصلہ توڑ کے رکھ دوں گا میں اِس بار تِرا
کارگر ہو نہیں پائے گا کوئی وار تِرا

تجھ کو کچھ کہہ کے کروں کیوں میں زباں اپنی خراب
ساری دُنیا کو تو معلوم ہے کِردار تِرا

کِس قدر ضبط کیا ہم نے یہ جی جانتا ہے
ذکر کرتے رہے احباب لگاتار تِرا

آ بھی جا لَوٹ کے او روٹھ کے جانے والے
راستہ دیکھ رہے ہیں در و دیوار تِرا

کہیں ایسا نہ ہو آنے کی ضرورت نہ رہے
عمر کی آخری منزل میں ہے بیمار تِرا

تو سزا دے کہ جزا دے یہ ہے تجھ پر موقوف
ہے تِرے قبضۂ قدرت میں گنہگار تِرا

تیرے وعدے پہ بھروسہ تو میں کرلوں لیکن
تیرے لہجے سے عیاں ہوتا ہے اِنکار تِرا

اب کسی اور کی چوکھٹ پہ پڑا ہے وہ شکیلؔ
کل بنا پھرتا تھا جو حاشیہ بردار تِرا

○

بھرم کھلے نہ کہیں میرے نکتہ چینوں کا
غرور ٹوٹ رہا ہے فلک نشینوں کا

○

پہنچے جو گھر تو ساری تھکن دوٗر ہو گئی
جو کچھ کما کے لائے تھے بچوں میں رکھ دیے

اب کہاں تیرے علاوہ کوئی بھاتا ہے مجھے
آنکھ اُٹھتی ہے جدھر تو نظر آتا ہے مجھے

درمیاں اپنی انا کو نہیں آنے دیتا
میں چلا جاتا ہوں جب بھی وہ بُلاتا ہے مجھے

بھول جاتا ہے وہ سب نازش و انداز و ادا
خود میں کھو جاتا ہے جب سامنے پاتا ہے مجھے

میرے ہونٹوں پہ نہیں آئے گا شکوہ کب تک
بس یہی سوچ کے ہردم وہ ستاتا ہے مجھے

اس پہ ہوتا ہی نہ تھا میرے منانے کا اثر
اب جو میں روٹھ گیا ہوں تو مناتا ہے مجھے

کوئی دیکھے تو سہی دیدہ دِلیری اُس کی
میرا پروردہ ہے اور آنکھ دِکھاتا ہے مجھے

یہ تو سب اُس کا کرم اُس کی عنایت ہے شکیلؔ
ورنہ سچ پوچھو تو کچھ بھی نہیں آتا ہے مجھے

پیش جو کچھ بھی ہماری زندگی میں آئے گا
لا محالہ ذکر اُس کا شاعری میں آئے گا

خودسری فطرت ہے اُس کی درگزر عادت مِری
وہ کرے گا بس وہی جو اُس کے جی میں آئے گا

پھر کسی دہقان کی کھیتی غصب کرلی گئی
دیکھنا سیلاب پھر اب کے ندی میں آئے گا

میں کہیں پاگل نہ ہو جاؤں خوشی سے دیکھنا
کہہ رہے ہیں سب کہ وہ کل پھر گلی میں آئے گا

منعقد ہوتی رہیں گی مجلسیں اچھی بُری
ہو گا جو جیسا مزا اُس کو اُسی میں آئے گا

چھیڑ کر قصّہ کوئی بچوں کو بہلا لیں گے ہم
جب کھلونے بیچنے والا گلی میں آئے گا

اِتنی خوش فہمی ہے کیوں اے دِل ذرا یہ تو بتا
ہم سے مِلنے کے لئے وہ کِس خوشی میں آئے گا

ارتقا کے نام پر پامال قدریں ہو گئیں
اب کہاں سے آدمی پن آدمی میں آئے گا

اُس کو آنے پر کوئی مجبور کر سکتا نہیں
آئے گا بیشک مگر جب اُس کے جی میں آئے گا

تُم کو آنا ہی پڑے گا میرے پاس اِک دِن شکیلؔ
کیا کرو گے اُس کا خط جب فارسی میں آئے گا

وہ ہوں ، ہم ہوں اور دریا کا کنارہ ہو شکیلؔ
ایسا موقع کب ہماری زندگی میں آئے گا

آئینہ دیکھوں اگر میں تو نظر تو آئے
میرے حصّے میں تِرے قُرب کی خوشبو آئے

مچھلیاں موج میں اِٹھلاتی ہوئی کیوں نہ پھریں
سَیر کرنے کے لئے تو جو لبِ جو آئے

سوچ بچوں کو سزا دینے سے پہلے منصف
کیوں کھلونوں کی جگہ ہاتھوں میں چاقو آئے

مجھ کو بھی پاس بُلانے کا اِشارہ ہو کوئی
میرے بھی کام کبھی جنبشِ ابرو آئے

مرضِ عشق ہو لاحق جِسے اے چارہ گرو
راس پھر اُس کو بھلا کیا کوئی دارو آئے

زندگی پر کوئی تکیہ تو نہیں ہے میرا
موت بھی مجھ کو گوارہ ہے اگر تو آئے

تم اُدھر روٹھے اِدھر مجھ کو جگڑنے کے لئے
رنج و غم ، درد و الم ، پہلو بہ پہلو آئے

میں تو کہتا ہوں کہ سولی پر چڑھا دینا مجھے
میری باتوں میں اگر فرق سرِ مو آئے

حشر میں آئیں گے جس وقت غلامانِ نبیؐ
شور اُٹھّے گا کہ لے تیرے رضا جو آئے

دِل میں حسرت ہی رہی تا دمِ آخر یہ شکیلؔ
مجھ سے مِلنے کے لئے کاش کبھی تو آئے

نہ تو خواہشِ زر و مال تھی نہ تو خواہشِ زر و مال ہے
تِرا لطف شاملِ حال تھا تِرا لطف شاملِ حال ہے

میں وفا سے ہاتھ اُٹھاؤں کیوں تجھے چھوڑ کر کہیں جاؤں کیوں
تِری دُشمنی سے غرض نہیں مِری دوستی کا سوال ہے

نہ تو منتظر کوئی سیم تن ، نہ ہے میرے دِل میں کوئی لگن
نہ تو پیرزن نہ میں کوہکن نہ پہاڑ ہے نہ کدال ہے

ہے یہ دین حق کا معاملہ نہیں کوئی منطق و فلسفہ
جو حرام ہے سو حرام ہے جو حلال ہے سو حلال ہے

کہیں اپنے آپ کو کھو نہ دے کوئی درد دِل میں پرو نہ دے
کہیں یہ تجھی کو ڈبو نہ دے تِرے خون میں جو اُبال ہے

مجھے کب کسی کا خیال تھا ، کوئی اور رنج و ملال تھا
تِرے وصل ہی کا سوال تھا جو محال تھا سو محال ہے

نہ ہو معترض مِرے نام پر مجھے فوقیت ہے تمام پر
ہوں شکیلؔ اپنے مقام پر نہ عروج ہے نہ زوال ہے

ذکرِ غمِ حالات نہ کر
یوں ضائع اوقات نہ کر

یاد اُس کو دِن رات نہ کر
تشہیرِ جذبات نہ کر

تو بھی دھوکہ کھائے گا
دھوکہ میرے ساتھ نہ کر

کِس کی ہوئی تو اے دُنیا
چل ہٹ مجھ سے بات نہ کر

قدر گھٹے گی تیری ہی
ردّ مِری خدمات نہ کر

لڑنا ہے تو سامنے آ
چھپ چھپ کر یوں گھات نہ کر

لُٹنے کا اندیشہ ہے
یوں رستے میں رات نہ کر

جو ہوتا ہے دیکھتا رہ
ظاہر محسوسات نہ کر

یہ اندھوں کی بستی ہے
آئینوں کی بات نہ کر

دُنیا تجھ سے واقف ہے
مانگے کی خیرات نہ کر

تیرا کیا کہنا ہے بول
اِس کی اُس کی بات نہ کر

اِس طرح آ کہ تجھے دیکھ نہ پائے کوئی
تا کہ پھر بعد میں اُنگلی نہ اُٹھائے کوئی

جس طرح ہم نے منایا ہے کسی کو اکثر
کاش ویسے ہی ہمیں آ کے منائے کوئی

کوئی مِلتا ہی نہیں جوڑنے والا دِل کا
قصّہٗ درد کِسے جا کے سُنائے کوئی

بات میں بات نِکل جاتی ہے آتے جاتے
بات تو جب ہے کہ آئے تو نہ جائے کوئی

خوف دُنیا کی نگاہوں کا ہے ناحق تم کو
مجھ میں کھو جاؤ کہ پھر دیکھ نہ پائے کوئی

کوئی اے کاش شکیؔل اُن سے یہ جا کر کہہ دے
ہم سے کیوں پردہ ہے کیا ہم ہیں پرائے کوئی

کوئی تمثیل نہیں اُس کی جو لائے کوئی
کیسے آئینے کو آئینہ دِکھائے کوئی

کرب اندر کا جھلک پڑتا ہے بیٹھے بیٹھے
کِس طرح ہونٹوں پہ مُسکان سجائے کوئی

اِس تعلق سے بڑی سخت وعید آئی ہے
مال ہرگز نہ یتیموں کا دبائے کوئی

جب عمل ہوگا تو پھر ردِّ عمل بھی ہوگا
نہ کہے ایک تو کیوں چار سُنائے کوئی

منتظر آج بھی ہیں فتح و ظفر کی راہیں
کشتیاں اپنی کنارے پہ جلائے کوئی

آدمی سب ہیں مگر بات ہے قسمت کی شکیلؔ
کوئی فاقے سے رہے موج اُڑائے کوئی

یہ صبح و شام کا منظر دھواں دھواں نہ رہے
اگر زمیں کے تعاقب میں آسماں نہ رہے

کہیں بھی ذِکر مِرا زیب داستاں نہ رہے
وہ چاہتے ہیں کہ باقی کوئی نشاں نہ رہے

اُنھیں بتادو کہ ایسا تو ہو نہیں سکتا
زمینِ شعر رہے اور آسماں نہ رہے

نہیں ہے پہلی سی اپنائیت تو حرج نہیں
یہی بہت ہے کہ وہ مجھ سے بدگماں نہ رہے

زمین خلق خدا پر جو تنگ کرتے تھے
کہیں سکون سے وہ زیرِ آسماں نہ رہے

بڑا تھا نام 'سکندر' کا اور 'دارا' کا
سو آج اُن کے مزاروں کے بھی نشاں نہ رہے

اُن کی باتوں میں آ کے دیکھتے ہیں
اِک فریب اور کھا کے دیکھتے ہیں

غم کی شدّت بڑھا کے دیکھتے ہیں
بار بار آزما کے دیکھتے ہیں

کیسی ہوتی ہے درد کی آواز
سب مجھی کو ستا کے دیکھتے ہیں

جھرّیاں پڑ گئیں ہیں چہرے پر
آیئنے مسکرا کے دیکھتے ہیں

ہم جلاتے ہیں اپنی شمعوں کو
لوگ تیور ہوا کے دیکھتے ہیں

جو لفظ لفظ میں تیور غزل کے دیکھتے ہیں
مِرے حریف مجھے ہاتھ مَل کے دیکھتے ہیں

یہ کون آیا سرِ بام دیکھنا تو سہی
یہ کس کو چاند ستارے نکل کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے اُس کو عقیدت ہے جوگیوں سے بہت
بدن پہ ہم بھی ذرا راکھ مَل کے دیکھتے ہیں

تمام بزم پہ وارفتگی کا عالم ہے
تِرے لبوں کو پیالے مچل کے دیکھتے ہیں

ہوا کے ساتھ اندھیروں کی ساز باز ہے کیا
چلو چراغ کے مانند جل کے دیکھتے ہیں

ہماری پیاس کی شدّت کا حال مت پوچھو
ہماری پیاس کو چشمے اُبل کے دیکھتے ہیں

سفر میں ہوتی ہے پہچان آدمی کی شکیلؔ
سو ہم بھی آج تِرے ساتھ چل کے دیکھتے ہیں

جو شخص خوش اخلاق و خوش اطوار نہیں ہے
وہ ایسا شجر ہے جو ثمر بار نہیں ہے

کیوں آج ترے ہاتھ میں تلوار نہیں ہے
کیا عافیت اپنی تجھے درکار نہیں ہے

مایوس ہوئے جاتے ہو کیوں شام کے مارو
کیا رات کا دامن سحر آثار نہیں ہے

مجھ کو نہ گرا پاؤ گے تم سیندھ لگا کر
وہ چھت ہوں جو مِنّت کشِ دیوار نہیں ہے

آمادہ نظر آتے ہیں سب سنگ زنی پر
کوئی مِری بستی میں گنہگار نہیں ہے

سوچا تھا کسی روز تو اِقرار بھی ہوگا
ہونٹوں پہ مگر اُس کے لگاتار 'نہیں' ہے

سب چھوڑ کے بیٹھا ہوں شکیلؔ اُس کی گلی میں
دُنیا سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے

گُمان ہوتا ہے مجھ کو بُلا رہا ہے کوئی
کئی دِنوں سے بہت یاد آ رہا ہے کوئی

مِرے خدا اُسے محفوظ رکھ تباہی سے
کہ میرے حال پہ خوشیاں منا رہا ہے کوئی

عجیب حال ہے مدّت سے دِل کی بستی کا
نہ آ رہا ہے کوئی اور نہ جا رہا ہے کوئی

اَجل خدا کے لئے یوں نہ جلد بازی کر
ذرا ٹھہر تو سہی دیکھ آ رہا ہے کوئی

مِری نگاہ نے کیا کہہ دیا خدا جانے
اب آئینے سے بھی آنکھیں چُرا رہا ہے کوئی

بساطِ وقت پہ مہرے بدلتے رہتے ہیں
ہم آپ خود نہیں چلتے چلا رہا ہے کوئی

وہی ہے مسئلۂ حُسن و عشق اب بھی شکیلؔ
بُھلا رہا ہے کوئی یاد آ رہا ہے کوئی

زہر جو میری نسوں میں ہے اُبھر سکتا ہے
کاٹنے والا مجھے خود بھی تو مر سکتا ہے

زندگی ناز اُٹھاؤں گا میں تیرے کب تک
تو ہے بیزار تو جی میرا بھی بھر سکتا ہے

جس بلندی سے کیا میں نے سفر کا آغاز
اُس بُلندی پہ کہاں کوئی ٹھہر سکتا ہے

مانگتا کس سے ہے تو خوبیٔ پرواز کی داد
جو اُڑا سکتا ہے وہ پر بھی کتر سکتا ہے

اختلاف اپنی جگہ عرضِ ہنر اپنی جگہ
تِرا دُشمن تِری تعریف بھی کر سکتا ہے

دِل میں آنکھوں میں میری روح کی گہرائی میں
وہ جہاں چاہے وہاں آ کے ٹھہر سکتا ہے

دیکھئے ہوتا ہے کیا عرضِ طلب کا انجام
دِل ہے بے تاب اِدھر اور اُدھر سکتہ ہے

تم نے تو کہہ دیا میّت میں بھی آؤ گے نہیں
اب نہ جی سکتا ہے بیمار نہ مر سکتا ہے

آج شہرت تجھے حاصل ہے تو اِترا نہ شکیلؔ
یہ پرندہ مِری چھت پر بھی اُتر سکتا ہے

○

خوابوں کی تعبیر عطا کر دے مولا
لفظوں کو تاثیر عطا کر دے مولا
عِلم کی دولت سے میں مالا مال رہوں
مجھ کو یہ جاگیر عطا کر دے مولا

وہ مِرے دِل میں مکیں آج بھی ہے
دِل جہاں کل تھا وہیں آج بھی ہے

میری وحشت میں کمی ہو بھی تو کیوں
چاند اُتنا ہی حسیں آج بھی ہے

تو جہاں چھوڑ گیا تھا اُس کو
تیرا دیوانہ وہیں آج بھی ہے

میرا اصرار بدستور وہی
اُس کے ہونٹوں پہ 'نہیں' آج بھی ہے

چھوٹ کل بھی تھی درندوں کے لئے
خون سے لال زمیں آج بھی ہے

عمر پر زور نہیں ہے لیکن
تیرے آنے کا یقیں آج بھی ہے

بات کرتے ہو وفا کی جو شکیلؔ
کیا یہ دستور کہیں آج بھی ہے

مصلحت کا شکار میں بھی نہیں
بات رکھتا اُدھار میں بھی نہیں

تو ہے مفلس تو اُس کا ذکر نہ کر
دیکھ سرمایہ دار میں بھی نہیں

تیرے ہونے سے ہے وجود مِرا
تو نہیں ہے تو یار میں بھی نہیں

عافیت ہے عزیز تجھ کو بھی
قابلِ اعتبار میں بھی نہیں

○

اِک طرف بزمِ جہاں ایک طرف دِل تنہا
طے کیئے ہم نے یونہی سارے مراحل تنہا

سر پٹکتی ہوئی موجوں کو تسلّی دے کر
دُکھ سمندر کے اُٹھاتا رہا ساحل تنہا

ہر اِک مہمان کو اسلاف کے تمغے بتائیں گے
نہ ہلکا پن کبھی اِتنا مِرے بچّے بتائیں گے

جو کچھ گذری ہے ہم پر ہم بھلا کیسے بتائیں گے
ہمارا حال ہم کو دیکھنے والے بتائیں گے

کہوں کیسے عزیزوں کے لہو کا رنگ پھیکا ہے
جو کچھ گذری ہے مجھ پر میرے ہمسائے بتائیں گے

حصولِ روشنی میں کن حدوں تک ہم نے کوشش کی
سرِ مقتل ہمارے نام کے کتبے بتائیں گے

حصارِ ذات سے باہر نِکل کے دیکھ اے اِنساں
حقیقت مہرِ عالم تاب کی ذرّے بتائیں گے

اُنھیں معلوم ہے اُن کا بھرم ہے جھوٹ پر قائم
کہاں سچّائی اپنی آپ کو جھوٹے بتائیں گے

لُٹنے کا کوئی ڈر نہیں کھونے کا اندیشہ نہیں
ہے دولتِ علم و ہُنر یہ دولتِ دُنیا نہیں

کیسے کہوں جاتے ہوئے اُس نے مجھے روکا نہیں
میں وقت کے ہمراہ تھا اِس واسطے ٹھہرا نہیں

میں دُشمنوں کے بیچ ہوں تُم دوستوں کے درمیاں
تم بھی اُدھر تنہا نہیں میں بھی اِدھر تنہا نہیں

یوں ہی نہیں ہوتا جنوں کب بے سبب بے چین ہوں
تم کو عزیزو کیا کہوں تم نے اُسے دیکھا نہیں

شکوہ نہ کر حالات کا رُخ موڑ دے جذبات کا
رکھ دھیان تو اِس بات کا کرتا کبھی مرتا نہیں

حالات کی زنجیر نے روکا ہے میرے پاؤں کو
میں بھول بیٹھا ہوں تجھے تیری قسم ایسا نہیں

جا اے شکیلؔ اُس کو منا ، رونے سے اب کیا فائدہ
دِل مت لگا پچھتائے گا ہم نے کہا تھا یا نہیں

آدمی بھول گیا انجمن آرائی میں
کام آئے گا نہ کچھ قبر کی گہرائی میں

کیا مِلا مجھ کو بھلا تیری شناسائی میں
بس یہی نا کہ بڑا نام ہے رُسوائی میں

بھول پائی نہ اُسے چشمِ فلک آج تلک
ہم غلاموں کا جو انداز تھا آقائی میں

حوصلہ ہارنا آتا نہیں بچّوں کو مِرے
مصلحت ہوگی یقینا کوئی پسپائی میں

دیکھنا پھر مِرے حالات دگرگوں تو نہیں
فرق آنے لگا احباب کی بینائی میں

پشت پر وار کیا کِس نے مجھے کیا معلوم
میں تو مشغول تھا یاروں کی پذیرائی میں

ہم بزرگوں کی روِش چھوڑ کے پچھتائے شکیلؔ
بچ کے نکلے جو کنویں سے تو گِرے کھائی میں

درد کے پھول کھلے ہجر کی انگنائی میں
ہم سُلگتے ہیں تری یاد کی پُروائی میں

خود فراموشی کا عالم ہے خود آرائی میں
آئینہ دیکھنے بیٹھے ہیں وہ تنہائی میں

دیکھتے ہیں کہ کوئی دیکھ رہا ہے کہ نہیں
خود نمائی کا بھی جذبہ ہے خود آرائی میں

لے لیا آپ نے دِل خیر کوئی بات نہیں
دیجئے اپنی محبت مجھے بھرپائی میں

اُس کے جانے سے عجب حال ہوا ساون کا
اب کے جھولے بھی نہ ڈالے گئے امرائی میں

اُس کی کھڑکی سے نظر آتا ہے میرا کمرہ
مجھ کو تنہائی بھی مِلتی نہیں تنہائی میں

ہم نے مجنوں کا بہت شور سُنا تھا لیکن
ہم سے آگے نہ بڑھا بادیہ پیمائی میں

دونوں اپنی جگہ مشہور ہیں یکتائی میں
تم ستم ڈھانے میں ہم صبر و شکیبائی میں

جس کو دیکھو نظر آتا ہے وہی سنگ بدست
ایسی کیا بات ہے آخر تِرے سودائی میں

اے خدا تو ہی کوئی راہ سجھا دے مجھ کو
آسماں ہوتا ہے حائل مِری اونچائی میں

ہجر کی رات میں بھی چاند نِکلتا ہے مگر
چاندنی رنگ جماتی نہیں انگنائی میں

میری آواز جو پڑ جاتی ہے کانوں میں شکیلؔ
وہ چلے آتے ہیں بے ساختہ انگنائی میں

آپ چاہیں یا نہ چاہیں مشتہر ہو جائے گی
دیکھئے اِک دِن محبت دردِ سر ہو جائے گی

یوں نہ اِتراؤ سجا کر ، تن پہ کاغذ کا لباس
کیا کرو گے راہ میں بارش اگر ہو جائے گی

تو میرے ٹوٹے ہوئے گھر کو حقارت سے نہ دیکھ
ایک دِن تیری حویلی بھی کھنڈر ہو جائے گی

سرزنش اولاد کی کرنے میں رکھیئے احتیاط
ڈرتے ڈرتے آپ سے اِک دِن نڈر ہو جائے گی

ہاتھ سے بچّے نکلتے جا رہے ہیں آج کل
کیا خبر تھی روشنی بھی دردِ سر ہو جائے گی

میرے بھائی تو قناعت کا لبادہ اوڑھ لے
ہر دُعا تیری ہم آغوشِ اثر ہو جائے گی

ہم نے ساری زندگی اِس کو سنبھالا ہے شکیلؔ
ہم نہ ہوں گے تو شبِ غم در بدر ہو جائے گی

وہ جو مجھ سے مِلا نہیں ہوتا
دِل کا دروازہ وا نہیں ہوتا

حُسنِ کردار دیکھا جاتا ہے
قد سے اِنساں بڑا نہیں ہوتا

راستہ دیکھ کر جو تو چلتا
منہ کے بَل یوں گِرا نہیں ہوتا

آدمی جو کرے لگن سے کرے
کام چھوٹا بڑا نہیں ہوتا

کچھ نہ کچھ بات ہوگئی ہوگی
کوئی یونہی خفا نہیں ہوتا

کون رُکتا ہے اُس درخت کے پاس
جِس کا سایہ گھنا نہیں ہوتا

دِل لگاؤ تو کچھ پتہ بھی چلے
درد ہوتا ہے یا نہیں ہوتا

آ کے بیمارِ غم کو دیکھ تو لو
دردِ دل لا دوا نہیں ہوتا

ہم تِرا نام جپتے رہتے ہیں
جب کوئی مشغلہ نہیں ہوتا

اُن کو ہم سے شکایتیں ہیں بہت
ختم یہ سلسلہ نہیں ہوتا

کوئی رہتا ہے میری آنکھوں میں
بے سبب رت جگا نہیں ہوتا

دربدر ہم بھٹک رہے ہیں شکیلؔ
کوئی دروازہ وا نہیں ہوتا

سوچ ہوتی ہے آدمی کی شکیلؔ
وقت اچھا بُرا نہیں ہوتا

خیال اُڑتے رہے مہر و ماہ سے آگے
بڑھا نہ کوئی مِری دست گاہ سے آگے

شبِ ستم ہے یوں روزِ سیاہ سے آگے
رواں ہو جیسے ہراول سپاہ سے آگے

اُدھر غضب کے مقابل ہے رحمتِ باری
اِدھر کھڑی ہے ندامت گناہ سے آگے

تھکن ابھی مِری پرواز کو گوارہ نہیں
مقام اور بھی ہیں مہر و ماہ سے آگے

کِسی کا نام نہ آجائے میرے ہونٹوں پر
نہ پوچھ کچھ مِرے حالِ تباہ سے آگے

جہاں مِلے تھے بچھڑنے سے پیشتر ہم تم
وہ پیڑ آج بھی ہے شاہراہ سے آگے

میرے علاوہ نہیں ہے کوئی حریف مِرا
نِکل چکا ہوں ہر اِک خیر خواہ سے آگے

مِرے نشانے پہ تھا بھاگتا ہوا دُشمن
نِکل چکا تھا مگر رزم گاہ سے آگے

مسابقت نہیں ہوتی ہے مرتبت پہ گواہ
بساطِ وقت پہ پیادہ ہے شاہ سے آگے

فضا میں پھیلا ہوا تھا انانیت کا دھواں
کٹے پڑے تھے کئی سر کلاہ سے آگے

زمانہ مجھ کو فراموش کر نہ پائے گا
ہیں میرے نقشِ قدم قتل گاہ سے آگے

زمانہ سر پہ اُٹھائے ہوئے پھرے گا شکیلؔ
نِکل کے دیکھ ذرا حبِّ جاہ سے آگے

آپ کو کیوں مِری حالت پہ ہنسی آتی ہے
رہیئے محتاط کہ تصویر بدل جاتی ہے

زندگی پوری توانائی سے لوٹ آتی ہے
لمس اُس شخص کے ہاتھوں کا طلسماتی ہے

بعد میں فیصلہ کرنا کہ مِلوں یا نہ مِلوں
پہلے یہ دیکھ تو لے کون ملاقاتی ہے

عمر بھر اُس کے لئے جان کھپاتے ہیں سبھی
یہ ضرورت ہے نہ تھکتی ہے نہ سُستاتی ہے

دست بردار میں ہو جاؤں یہ ناممکن ہے
اے غزل تجھ سے تعلق مِرا جذباتی ہے

تنگ آ کر غمِ حالات کا شکوہ مت کر
مِرے بھائی یہ جو تکلیف ہے لمحاتی ہے

کوئی ٹھہرا تھا کبھی آ کے گھڑی بھر کے لئے
یاد اب تک در و دیوار کو مہکاتی ہے

فرق پڑنے کا نہیں ہونے نہ ہونے سے ترے
مجھ کو ہر حال میں جینے کی ادا آتی ہے

روکتا ہوں میں تجھے تیرے بھلے کو ہی شکیلؔ
فائدہ اِس میں کہاں میرا کوئی ذاتی ہے

کون بتلائے اُسے حال ترا جا کے شکیلؔ
مسئلہ یہ تو مِرے بھائی ترا ذاتی ہے

وہ جِن کو مِلی شہر میں پہچان مجھی سے
دُکھ ہے کہ نظر آتے ہیں انجان مجھی سے

دُنیا کے رویّے کی ہے پہچان مجھی سے
وابستہ ہے ہر درد کا عنوان مجھی سے

کچھ لوگ جنہیں سچ کی سند میں نے عطا کی
منسوب وہ کرنے لگے بُطلان مجھی سے

دُنیا سے کیا جِن کے لئے میں نے کنارا
برگشتہ ہوئے جاتے ہیں ہر آن مجھی سے

پہلے سے ہی محسوس ہوا کرتا تھا مجھ کو
اُلجھیں گے کسی روز یہ نادان مجھی سے

کچھ لوگ ہیں مصروف مِری بیخ کنی میں
کہدو کہ ہے شاداب یہ دالان مجھی سے

میں اُن کے لئے فتح کا ضامن تو ہوں لیکن
ڈرتا ہوں نہ مانگیں کہیں تاوان مجھی سے

صحرا میں مِرے نام سے پھرتے ہیں بگولے
دریا میں اُٹھا کرتے ہیں طوفان مجھی سے

معلوم ہوا یہ کہ ہوں خود اپنا ہی دُشمن
پہنچا ہے مِری ذات کو نقصان مجھی سے

اووروں سے تو ہنس بول لیا کرتا ہے اکثر
رکھتا ہے عداوت تِرا دربان مجھی سے

اِس بات سے واقف ہیں شکیلؔ اہلِ بصیرت
ہے شہرِ سخن میں میری پہچان مجھی سے

کہاں عکس میں نے ریا کا نہ دیکھا
مگر ماں کے چہرے پہ چہرہ نہ دیکھا

شریفوں کی بستی میں ہے معتبر وہ
شرافت سے جِس کا علاقہ نہ دیکھا

تعلق نہیں ہے تو پھر ذکر کیوں ہو
ہمیں اُس سے کیا اُس نے دیکھا نہ دیکھا

کِسی دِن نہ پورا کیا تو نے وعدہ
تِرا راستہ ہم نے روزانہ دیکھا

تعلق رہا عمر بھر رنج و غم سے
خوشی نے مِرے گھر کا رستہ نہ دیکھا

جھلس جاتا ہے دیکھ کر سچ کا سورج
کبھی جھوٹ کا پیڑ پھلتا نہ دیکھا

فلک سے جو ٹوٹے تھے مغرور تارے
زمیں پر بھی اُن کا ٹھکانہ نہ دیکھا

شبِ ہجر گذری ہے کیسے نہ پوچھو
سرِ چشم بھی کوئی تارا نہ دیکھا

یہ بستی ہے محنت کشوں کی ، کسی نے
دھواں روز دے جو ، وہ چولہا نہ دیکھا

شکیلؔ اُن کا اِترانا اپنی جگہ ہے
مگر کوئی بھی تیرے جیسا نہ دیکھا

ہاں ہاں یہ بات آئی ہے میرے بھی کان پر
تہمت لگا رہی ہے زمین آسمان پر

مجھ کو نہ چھیڑ ورنہ بن آئے گی جان پر
میں ایسا تیر ہوں جو کھِنچا ہے کمان پر

برسوں جگر کا خون جلا کر زمیں پہ ہوں
دو چار شعر کہہ کے نہ اُڑ آسمان پر

کج فہم آدمی کو نصیحت فضول ہے
پانی کبھی ٹھہرتا نہیں ہے ڈھلان پر

کہہ دو اُسے کہ وقت کسی کا نہیں ہوا
اِترا رہا ہے وہ جو ذرا سی اُڑان پر

اب دُشمنوں کی زد پہ کھڑا ہوں تو کیا کروں
مجھ کو بڑا یقین تھا تیری امان پر

سب کو بتا رہا ہے وہ حیلے نئے نئے
ہم تو اٹل ہیں آج بھی اپنے بیان پر

ہم پر خدا کی خاص عنایت ہے یہ شکیلؔ
ہم لوگ فخر کرتے نہیں خاندان پر

○

کوئی تجھ سا نہ مِلا چاہنے والا ہم کو
بے کسی تو نے بڑے ناز سے پالا ہم کو

کون اپنا تھا غم و رنج و مصائب کے سِوا
اِنہی بے چاروں نے مِل جُل کے سنبھالا ہم کو

دھیرے دھیرے تِرے انداز سمجھ میں آئے
اوّل اوّل تو بہت دِل نے اُچھالا ہم کو

کل زمانہ ہمیں ڈھونڈے گا کتابوں میں شکیلؔ
نہ سہی آج کوئی پوچھنے والا ہم کو

لوگ کہتے ہیں روشنی کم ہے
سچ تو یہ ہے کہ آگہی کم ہے

کل بھی کم تھی وفا زمانے میں
ہاں مگر آج اور بھی کم ہے

میں پھر اُن کو عزیز کیوں نہ رکھوں
میرے بچوں میں خودسری کم ہے

تجربہ کر کے دیکھ لے تو بھی
جھوٹ کی عمر واقعی کم ہے

اِس لئے میں گراں گذرتا ہوں
میرا لہجہ بناوٹی کم ہے

خود فریبی میں مبتلا مت ہو
تجھ کو دُنیا سے آگہی کم ہے

ہم نے دیکھا تِرا کلام شکیلؔ
سچ زیادہ ہے شاعری کم ہے

بتاؤ اونچ نیچ کا خیال کیسے آ گیا
رفاقتوں کے بیچ یہ سوال کیسے آ گیا

تمہارا طنز میری عظمتوں کا اعتراف ہے
نہ تھا میں آفتاب تو زوال کیسے آ گیا

بتا رہے تھے سب کہ وہ بہت ہی خوش مزاج ہے
ہماری بات پر اُسے جلال کیسے آ گیا

سمجھ رہے تھے ہم کہ لوگ روشنی کو روئیں گے
یہ راستوں پہ ہر طرف گلال کیسے آ گیا

وہ دیکھنے لگا ہے مجھ کو شک بھری نگاہ سے
میں سوچتا ہوں آئینے میں بال کیسے آ گیا

خفا وہ اِس پہ ہے کہ وہ تو بام پر گیا نہیں
مجھے یقینِ رویتِ ہلال کیسے آ گیا

سِتم سے ہاتھ اُٹھا کے اُس نے اور بھی سِتم کیا
اُسے مِری وفاؤں کا خیال کیسے آ گیا

مصاحبوں سے پوچھنے لگا وہ مجھ کو دیکھ کر
خوشی کی بزم میں یہ خستہ حال کیسے آ گیا

نہ مجھ کو اُس سے عشق تھا نہ اُس کو میری آرزو
مِرے نصیب میں وہ خوش جمال کیسے آ گیا

سمجھ رہے تھے ہم تو اُس کو دُشمن اپنی جان کا
ہمارے سامنے وہ بن کے ڈھال کیسے آ گیا

اُچھل رہا ہے کس کی شہ پہ دوستو پتہ کرو
جمے ہوئے لہو میں یہ اُبال کیسے آ گیا

تمام عمر جِن کو لوٹ مار سے شغف رہا
وہ پوچھتے ہیں میرے پاس مال کیسے آ گیا

مخالفت کے باوجود چاہتے ہیں سب تجھے
بتا شکیؔل تجھ میں یہ کمال کیسے آ گیا

کہنے سُننے کو اب رہا کیا ہے
تم نے تو کہہ دیا تِرا کیا ہے

اچّھے اچّھوں کو موت آئی ہے
میں بھی مر جاؤں تو بُرا کیا ہے

منہ تکیں آنے جانے والوں کا
اب ہمیں اور مشغلہ کیا ہے

دِل کو اب چین ہی نہیں مِلتا
تیری آنکھوں نے کہہ دیا کیا ہے

پار کرتا ہے جذبۂ صادق
ورنہ مٹّی کا اِک گھڑا کیا ہے

یونہی کرتا رہا جو من مانی
تجھ پہ کھُل جائے گا خدا کیا ہے

تم کرو فکر گھر بچانے کی
میں ہوں فِٹ پاتھ پر مِرا کیا ہے

خاک ہو جاتے ہیں شکار اِس کے
کیا بتائیں تمہیں انا کیا ہے

دِل تو پھر دِل ہے آ گیا تم پر
اِس میں ناچیز کی خطا کیا ہے

میرے احباب کامیاب رہیں
بجز اس کے مِری دُعا کیا ہے

اُس کی آنکھوں کا سحر طاری ہے
ہم سے مت پوچھئے نشہ کیا ہے

ڈھونڈتے کیا ہو میری آنکھوں میں
آنسوؤں کے سِوا دھرا کیا ہے

کیوں بتاؤں تمہیں یہ راز شکیلؔ
میرا اُس کا معاملہ کیا ہے

درونِ سلطنتِ جادواں سے گذری ہے
زمینِ شعر غزل آسماں سے گذری ہے

یہ زخم زخم بدن بے سبب نہیں ہے میاں
ہماری ذات فریبِ اماں سے گذری ہے

مجھے تو یاد نہیں تجھ کو یاد ہو تو بتا
تِری 'نہیں' بھی کسی روز 'ہاں' سے گذری ہے

پتہ چلا یہ مہکتی ہوئی ہواؤں سے
کہ آج اُس کی سواری یہاں سے گذری ہے

تِرے بغیر ہے منظر اُداس اُداس بہت
بہار ہو کے خجل گلستاں سے گذری ہے

لوگ تیرے لئے کیا کچھ نہیں کر جاتے ہیں
زندگی تیرا تقاضا ہو تو مر جاتے ہیں

ہم نے اپنوں سے وہ تکلیف اُٹھائی ہے کہ اب
کوئی اپنا نظر آتا ہے تو ڈر جاتے ہیں

تیری یادوں کے جھروکوں سے جو آتی ہے ہوا
قافلے اب بھی بہاروں کے ٹھہر جاتے ہیں

جوش میں آ کے سمندر کا اُڑاتے ہیں مذاق
سوکھے تالاب جو برسات میں بھر جاتے ہیں

تم کو ہر حال میں خمیازہ بھگتنا ہوگا
نشے کیسے بھی ہوں کچھ دِن میں اُتر جاتے ہیں

دیکھ میلہ نہ سمجھ جنگ کا میدان ہے یہ
اِس میں دستاریں نہیں جاتی ہیں سر جاتے ہیں

تم تو بس شہر کی سڑکوں پہ بھٹکتے ہو شکیلؔ
رات ہوتی ہے تو سب لوٹ کے گھر جاتے ہیں

کون ہے در پہ جلدی سے آ دیکھ کر
کِس نے آواز دی ہے بتا دیکھ کر

یوں نہ ہنسیے کسی کا بُرا دیکھ کر
وقت ناراض ہو جائے گا دیکھ کر

اب جو ٹھوکر لگی ہے تو روتا ہے کیوں
میں نہ کہتا تھا چل راستہ دیکھ کر

میرے پیشِ نظر اُن کی اِصلاح تھی
وہ خفا ہو گئے آئینہ دیکھ کر

مشکلیں مجھ سے کترا کے جانے لگیں
میرے ہاتھوں میں دامن ترا دیکھ کر

یہ سمندر ہے تجھ کو بھی کھا جائے گا
خوش نہ ہو تو مجھے ڈوبتا دیکھ کر

زندگی کو برتنے کی طاقت نہیں
خوف آتا ہے آبِ بقا دیکھ کر

مستقل اُن کا کوئی نظریہ نہیں
لوگ کرتے ہیں باتیں ہوا دیکھ کر

بام پر یوں نہ بے پردہ آیا کرو
چاند شرمندہ ہو جائے گا دیکھ کر

دولتِ ضبط ہاتھوں سے جاتی رہی
لُٹ گئے ہم تِرا دیکھنا دیکھ کر

تیرا برتاؤ کب تھا قیامت سے کم
دنگ کیوں ہے مِرا حافظہ دیکھ کر

تم تہی دست ہو تو اکیلے رہو
دوست بنتے ہیں اب فائدہ دیکھ کر

اپنے اپنے مقدر سے پاتے ہیں سب
کیوں جلے ایک کو دوسرا دیکھ کر

اے شکیلؔ اُس کو دیکھا تو ہم نے بھی ہے
دِل مگر دے دیا تم نے کیا دیکھ کر

یہ معجزہ یقین کی تاثیر سے نہ ہو
ہو خاک سے وہ کام جو اکسیر سے نہ ہو

دُنیا کے کاروبار بھی اپنی جگہ مگر
غافل درونِ ذات کی تطہیر سے نہ ہو

پڑتا ہے مجھ پہ سچ کا بھی دورہ کبھی کبھی
ناراض اِس قدر مِری تقریر سے نہ ہو

ممکن نہیں کہ سچ کے مقابل ٹھہر سکے
تو بدحواس جھوٹ کی تشہیر سے نہ ہو

میں لے کے ایسے آئینہ خانے کو کیا کروں
آراستہ جو آپ کی تصویر سے نہ ہو

کیوں صرف اُس کی پُشت ہوئی ہے لہولہان
زخمی وہ اعتماد کی شمشیر سے نہ ہو

تم نے کہا تھا اس سے مِلی تھی نظر شکیلؔ
دِل میں جو ہے خلِش یہ اُسی تیر سے نہ ہو

مِرے خلاف جو ہر وقت زہر اُگلتا ہے
سُنا ہے میری محبت کا اُس کو دعویٰ ہے

دِکھائی دیتا ہے ویسا جو جیسا ہوتا ہے
مِرا وجود تو اِک آئینے کے جیسا ہے

یہ اور بات کہ وہ دیکھنے میں تنہا ہے
مِلو گے اُس سے تو معلوم ہوگا کیا کیا ہے

یونہی کھِلے نہیں فِکر و نظر کے گُل بوٹے
زمینِ شعر کو ہم نے لہو سے سینچا ہے

کہاں تم آ گئے بونوں کی انجمن میں شکیلؔ
یہاں تو سب کو ہی قد آوری کا دعویٰ ہے

سارے جگ سے نام چھپایا میں نے جس ہرجائی کا
ہنس ہنس کر وہ پوچھ رہا ہے حال مِری رُسوائی کا

ذلّت اور ہزیمت سمجھو قسمت میں لِکھ اُٹھتی ہے
جنگ کے میداں میں آ جائے دھیان اگر پسپائی کا

زخمی ہو کر گِرتے گِرتے دیکھی تھی بس ایک جھلک
وہ میرے دُشمن کا چہرہ تھا یا میرے بھائی کا

سچّی بات یہی ہے اکثر ہم نے یہ دیکھا ہے شکیلؔ
جھوٹے لوگ ہی دعویٰ کرتے رہتے ہیں سچائی کا

آدمی جائے تو جائے کس طرح بازار تک
قدر کھوتے جا رہے ہیں دِرہم و دینار تک

باعثِ تقلید ہوگا تیرا ہر طرزِ عمل
دین کو محدود مت رکھ جُبّہ و دستار تک

اب ہُوا معلوم وہ آسودگی تو گھر میں تھی
کھوج میں جس کی چلے آئے سمندر پار تک

کر دیے جاتے نظر انداز ایسے تو نہ تھے
ہم بھی بِک جاتے مگر پہنچے نہیں بازار تک

ماہتاب اپنی جگہ شاخِ گلاب اپنی جگہ
کوئی خوبی میں نہیں پہنچا تِرے معیار تک

نامُرادی پاؤں کی زنجیر ہو کر رہ گئی
سایۂ دیوار سے پہنچے نہ ہم دیوار تک

پاسداری اپنی خودداری کی کرتے ہیں شکیلؔ
خواہشوں کو ہم نہیں لاتے لبِ اِظہار تک

پھونک دیتے ہیں پڑوسی کا گھر آنگن کیسے
لوگ بن جاتے ہیں جذبات کا ایندھن کیسے

دیکھتے دیکھتے ہو جاتی ہے ان بن کیسے
دوست بے ساختہ ہو جاتے ہیں دُشمن کیسے

تو ابھی ہجر کے موسم سے نہیں گزرا ہے
پوچھ مت آگ لگا دیتا ہے ساون کیسے

دیکھ کر حال مِرا تم کو ہنسی آتی تھی
اب پڑی خود پہ تو کرنے لگے تن پھن کیسے

مجھ کو اللہ کی رحمت پہ بھروسہ ہے شکیلؔ
چھوڑ سکتا ہوں میں اُمید کا دامن کیسے

عِلمیت جُبّہ و دستار کی محتاج نہیں
روشنی گنبد و مینار کی محتاج نہیں

مِٹ گئے کتنے ہی اردو کو مِٹانے والے
یہ زباں وہ ہے جو سرکار کی محتاج نہیں

سر برہنہ تو مجھے دیکھ کے حیران نہ ہو
میری عظمت کسی دستار کی محتاج نہیں

پھوٹ پڑتا ہے کسی وقت بھی بستی میں فساد
اب یہ لعنت کسی تہوار کی محتاج نہیں

سرپھری موجوں کو بھی دانتوں پسینہ آ گیا
سامنے طوفاں کے جب میرا سفینہ آ گیا

ہائے پھر پتھر کی زد میں آبگینہ آ گیا
اُس کی باتوں میں کہاں سے دِل کمینہ آ گیا

کیجئے اپنی انانیت کا بھی کوئی علاج
یہ نہ کہئے دوستوں کے دِل میں کینہ آ گیا

دوست آخر ڈھونڈنے جاتے کہاں کوئی ہدف
شاد ہوں میں کام اُن کے میرا سینہ آ گیا

آئینہ خانے سجائے جا رہے ہیں کس لئے
شہر میں اندھوں کے آخر کون بینا آ گیا

اب کسی کی بے وفائی کا قلق ہوتا نہیں
آتے آتے ہم کو جینے کا قرینہ آ گیا

آج کل تم بھی بہت سج دھج کے پھرتے ہو شکیلؔ
کیا تمہارے ہاتھ بھی کوئی دفینہ آ گیا

دِل میں کوئی ارمان رہا ہو تو کہیں بھی
مقصود کوئی تیرے سِوا ہو تو کہیں بھی

واقف ہی نہیں ہم بجُز احباب کسی سے
دُشمن کا کوئی نام پتا ہو تو کہیں بھی

ہم اپنی جگہ اُن کا مفاد اپنی جگہ ہے
یاروں سے ہمیں کوئی گِلہ ہو تو کہیں بھی

دُکھ درد تو ویسے بھی مقدّر میں لکھے تھے
کچھ اور عزیزوں سے مِلا ہو تو کہیں بھی

سچ کہنے کی عادت نے کہیں کا نہیں رکھّا
بے وَجہہ کوئی ہم سے خفا ہو تو کہیں بھی

کس طرح گزرتے ہیں شب و روز ہمارے
مائِل بہ کرم کوئی ذرا ہو تو کہیں بھی

کیا پوچھتے ہو حال شکیلؔ ابن شرفؔ کا
یہ نام کبھی ہم نے سُنا ہو تو کہیں بھی

وہ کرگس شاہبازی کر رہا ہے
مسلسل جعلسازی کر رہا ہے

وہ سب کی ذہن سازی کر رہا ہے
حقیقی کو مجازی کر رہا ہے

یقینا منہ کی کھائے گا کِسی دِن
جو سب سے چال بازی کر رہا ہے

خفا کچھ لوگ مجھ سے ہو رہے ہیں
عطا وہ سرفرازی کر رہا ہے

مثلِ حبابِ بحر کہیں بے نشاں نہ ہو
کہدو زمیں زمیں ہی رہے آسماں نہ ہو

خود کو قصور وار بتاتا ہوں اِس لئے
میں چاہتا ہوں تجھ سے کوئی بد گماں نہ ہو

اللہ کے کرم سے وہ بیٹا مِلا مجھے
جس کو یہ فکر رہتی ہے ناراض ماں نہ ہو

دِل کاروبارِ شوق میں جلتا ہے رات دِن
کیوں شہرِ آرزو میں دھواں ہی دھواں نہ ہو

آپس کا اختلاف بھی مِٹ جائے گا ضرور
لیکن یہ شرط ہے کہ کوئی درمیاں نہ ہو

آمادۂ ستم نظر آتا ہے ہر کوئی
میری طرح جہاں میں کوئی بے اماں نہ ہو

سجدے مچل اُٹھے ہیں جبینِ نیاز میں
نزدیک اُن کا سنگ درِ آستاں نہ ہو

میں جس کو چاہتا تھے مجھے مِل گیا شکیلؔ
کیوں آج مِرے زیرِ قدم آسماں نہ ہو

○

رات دِن لوہے سے ٹکراتا ہے وہ
تب کہیں دو وقت کی پاتا ہے وہ

○

یہ اور بات پتنگوں کو خاک ہونا پڑا
چراغ ہم نے جلائے تھے روشنی کے لیے

آوارہ پنچھیوں کا ٹھکانہ نہیں رہا
آنگن میں اِک درخت پُرانا نہیں رہا

کیوں لوگ لڑ رہے ہیں قیادت کے نام پر
بستی میں تیری کیا کوئی دانا نہیں رہا

جو لوگ اُڑ رہے تھے بہت آسمان پر
اُن کا زمین پر بھی ٹھکانہ نہیں رہا

کب مجھ کو اپنے کام کی اُجرت نہیں مِلی
کب میری دسترس میں خزانہ نہیں رہا

ہمدرد سب کے سب تھے مگر وقت جب پڑا
کوئی بھی میرے شانہ بہ شانہ نہیں رہا

جمہوریت نے سب کو کنارے لگا دیا
محفوظ کوئی راج گھرانہ نہیں رہا

لَوٹا جو سر پہ گردِ مسافت لئے ہوئے
بستی میں کوئی دوست پُرانا نہیں رہا

عمرِ رواں نے ساری تب و تاب چھین لی
مانوس ہم سے آئینہ خانہ نہیں رہا

آنکھیں یونہی دِکھائیں گی طاغوتی طاقتیں
ایماں اگر شکیلؔ توانا نہیں رہا

○

وقت کے جبر سے محفوظ نہ رہ پاؤ گے
حوصلہ تم میں اگر ضرب لگانے کا نہیں

بے سبب نہیں دہشت تخت و تاج والوں میں
سب کے سب مجاہد ہیں ہم شکستہ حالوں میں

تھی بلا کی سفّا کی فتح پانے والوں میں
سارے شاہزادوں کے سر سجے تھے تھالوں میں

چاہ کر بھی ہونٹوں سے بددعا نہیں نِکلی
تھے سبھی میرے اپنے زخم دینے والوں میں

شیام جی کی مُرلی نے آج پھر غضب ڈھایا
کھوج میں تھے رادھا کی گھِر گئے گوالوں میں

دیکھ کر عزیزوں کی خوش گمانیاں ہم نے
بند کر لیا خود کو مصلحت کے تالوں میں

زندگی برتنے کا حوصلہ جو پانا ہے
دیکھ ہم جیالوں کو بیٹھ ہم جیالوں میں

چاند تم ہتھیلی پر کیا ہمیں دِکھاتے ہو
دھوپ تجربوں کی ہے اِن سفید بالوں میں

وقت کی نوازش پر اِس قدر نہ اِتراؤ
لوگ بھول جائیں گے تم کو چند سالوں میں

وقت نے شکیلؔ آخر تم کو بھی بدل ڈالا
جھرّیاں ہیں چہرے پر برف سی ہے بالوں میں

○

ہم ایسوں کو مت اپنی پہچان میں رکھ
تو بھی رُسوا ہو جائے گا دھیان میں رکھ

مجاہد کہلوائے بس یہ سودا سر میں رہتا ہے
زمینِ امن پر بھی وہ زِرہ بکتر میں رہتا ہے

کمر بستہ ہمیشہ خدمتِ آزر میں رہتا ہے
برہمن یہ سمجھتا ہے خدا پتھر میں رہتا ہے

کسی کی یاد سے معمور رہنا چاہئے سینہ
مِثل مشہور ہے شیطان خالی گھر میں رہتا ہے

بُرائی کو بُرائی سے مِٹایا جا نہیں سکتا
بتاؤ خیر کا پہلو بھی کوئی شر میں رہتا ہے

ہماری خستہ حالی پر تعجب مت کرو صاحب
ہُنر لِپٹا ہوا افلاس کی چادر میں رہتا ہے

ہمیشہ دور رہتا ہے حیا کی آڑ میں مجھ سے
مگر ہر وقت میری سوچ کے محور میں رہتا ہے

کبھی خاطر میں وہ لاتا نہیں دُشمن کی کثرت کو
عزیزو ! جذبۂ ایثار جس لشکر میں رہتا ہے

نظر آئے گا تم کو میری آنکھوں کے جھرونکوں سے
مِرا دِل اُس کا گھر ہے وہ ہمیشہ گھر میں رہتا ہے

نہیں آسکتی ہرگز تیرہ بختی میری چوکھٹ تک
مِری ماں کی دُعاؤں کا اُجالا گھر میں رہتا ہے

فرشتہ موت کا ہنستا ہے اُس کی سادہ لوحی پر
کوئی معروف جب تزئینِ بام و در میں رہتا ہے

شکیلؔ اہلِ نظر نے یہ تماشہ بارہا دیکھا
وہ کھا جاتا ہے چکّر جو مِرے چکّر میں رہتا ہے

شکیلؔ اس بات سے انکار کوئی کر نہیں سکتا
جو منظر کو جلا دیتا ہے پس منظر میں رہتا ہے

دِل میں انساں کے نہ جب تک ہوسِ زر جاگے
غیر ممکن ہے کوئی خوف کوئی ڈر جاگے

نااُمیدی کے اُفق پر کوئی خاور جاگے
اب تو ہم تیرہ نصیبوں کا مقدّر جاگے

دوستو جاگتی قوموں کو ہی مِلتا ہے عروج
ہم جو سوئے ہیں تو کس طرح مقدر جاگے

کیا کریں اہل سیاست کا وتیرہ ہے یہی
لُٹ گیا زادِ سفر تب کہیں رہبر جاگے

دیر سے گھات لگائے ہوئے چپ ہیں موجیں
نیند ملّاح کو آئے تو سمندر جاگے

ایک در بند ہوا ہے تو کھلے ہیں سو در
داغ سورج نے دیا تو مہ و اختر جاگے

پھر نگاہوں میں کھٹکنے لگا اللہ کا گھر
پھر ضرورت ہے ابابیلوں کا لشکر جاگے

ہم کو بھی تھی کسی اُگتے ہوئے سورج کی تلاش
رات بھر ہم بھی ستاروں کے برابر جاگے

جب بھی سورج کو نکلتے ہوئے دیکھا ہے شکیلؔ
میری آنکھوں میں کئی ڈوبتے منظر جاگے

○

اندر سے یہ زمین معطر ہے کس قدر
کھلتا ہے جو بھی پھول مہکتا ضرور ہے

اب یاد ہمیں کوئی کہانی بھی نہیں ہے
پہلی سی طبیعت میں روانی بھی نہیں ہے

میں وہ ہوں کہ جس کا کوئی ثانی بھی نہیں ہے
ویسے مجھے زعمِ ہمہ دانی بھی نہیں ہے

حالات سے سمجھوتہ کیے ہو گئی مدّت
اب حوصلۂ نقل مکانی بھی نہیں ہے

ہو سکتا ہے یاروں کی شکایت بھی بجا ہو
بے وجہ مِری تلخ بیانی بھی نہیں ہے

ہر سِمت مِرے نام کا اُڑتا تھا پھریرا
یہ بات کوئی اِتنی پُرانی بھی نہیں ہے

ہو جائے نہ بنجر کہیں احساس کی وادی
اب سلسلۂ آب رسانی بھی نہیں ہے

جانم تِرا پندارِ انا ہی نہیں ٹوٹا
محفوظ مِرا خواب جوانی بھی نہیں ہے

آتی ہے مِرے خوابوں میں مہکار کہاں سے
آنگن میں تو اب رات کی رانی بھی نہیں ہے

کیوں سر پہ بٹھاتے ہو شکیلؔ ابن شرفؔ کو
عامِل بھی نہیں ہے کوئی گیانی بھی نہیں ہے

○

سب اپنی اپنی شباہت تلاش کرتے رہے
کھلا ، کہ شکل پسِ آئینہ کسی کی نہیں

کیوں نہ ہم شرم سے منہ اپنا چھپانے لگ جائیں
سارے احباب جب احسان جتانے لگ جائیں

وقت برگشتہ ہے لیکن یہ ضروری تو نہیں
ہم بھی اوروں کی طرح شور مچانے لگ جائیں

شاعری خون میں شامل ہے مگر یوں بھی نہیں
جو بھی مِل جائے اُسے شعر سُنانے لگ جائیں

قیس و فرہاد کے قصّوں سے چلا لیتا ہوں کام
اپنی روداد سُناؤں تو زمانے لگ جائیں

یوں نہ تشہیر کرو میری زبوں حالی کی !
لوگ اُنگلی کہیں تم پر نہ اُٹھانے لگ جائیں

اِنکساری کو شعار اپنا بناؤ تو شکیلؔ
لوگ تم کو بھی سر آنکھوں پہ بٹھانے لگ جائیں

چاندنی مضمحِل ہو گئی چاند خود سے خفا ہو گیا
بام پر آپ کیا آ گئے سارا منظر نیا ہو گیا

سادگی میں ہے وہ دِل کشی جس کی تمثیل مِلتی نہیں
دیکھ کر اُس کی رعنائیاں دم بخود آئینہ ہو گیا

تیری آنکھیں ستارہ صفت اُن کی تاثیر پارہ صفت
پڑ گئی جس پہ تیری نظر چین اُس کا ہوا ہو گیا

مِل گیا قرب جِس کو ترا اُس کی قسمت کا کیا پوچھنا
اُس کو دُنیا سے کیا واسطہ جو تِرا آشنا ہو گیا

تیرے رُخسار ولب کی قسم بِن ترِے جی نہ پائیں گے ہم
جان دے دیں گے ہم اے صنم تو اگر بے وفا ہو گیا

متفق سب ہیں اِس بات سے تیرے جلووں کی سوغات سے
آئینے کو جِلا مِل گئی آئینہ آئینہ ہو گیا

جس کے گھر کے در و بام سے روشنی پا رہے تھے سبھی
کیوں اندھیرے میں بیٹھا ہے وہ اے شکیلؔ اس کو کیا ہو گیا

غضب ہوا تجھے چاہا جو ماہرو میں نے
بنا لیا ہے ہر اِک دوست کو عدو میں نے

گلوں سے پوچھ، ستاروں سے پوچھ، چاند سے پوچھ
کیا ہے کب تِری تعریف میں غلو میں نے

ہے لہر لہر وہ منظر مِری نگاہوں میں
کسی کو دیکھا تھا اِک دِن کنارِ جو میں نے

اثر پذیر طبیعت کا ہے قصور اے دوست
جو تجھ سے کی ترِے لہجے میں گفتگو میں نے

بُرا وہ مان گئے غیریت سمجھ کے شکیلؔ
کیا نہ اُن کو مخاطب جو کہہ کے تو میں نے

بھلا وہ کیسے نبھائیں گے اجتناب کی راہ
کہ بند ہو نہیں سکتی خیال و خواب کی راہ

لکھیں گے روز اُسے خط میں اِک نیا مضمون
وہ ہم نہیں ہیں کہ دیکھا کریں جواب کی راہ

بغیر رنج اُٹھائے خوشی نہیں مِلتی
بھری ہے کانٹوں سے اے ہمنشیں گلاب کی راہ

نفاق ڈالنے والوں کا ہے بُرا انجام
تو چھوڑ دے مِرے بھائی یہ ہے عذاب کی راہ

ابھی تلک درِ خیبر سے آ رہی ہے صدا
کِسے مجال کے روکے ابوتراب کی راہ

شکیلؔ ہم کسی رانجھے سے کم نہیں لیکن
کوئی تو ہیر کی صورت تکے جناب کی راہ

سمجھتا ہے کرم تیرا غم و آلام و حرماں کو
دِل اب تک یاد کرتا ہے تِرے اِک ایک احساں کو

لڑا کر آنکھ بھر پائے دُعا کیوں کر اثر پائے
جُدا دِل سے نہ کر پائے کبھی ہم یاد مژگاں کو

کوئی پھر یاد آتا ہے نگاہوں میں سماتا ہے
کہ دِل پھر لے کے جاتا ہے طوافِ کوئے جاناں کو

ادائے دلبری آخر ادائے دِلبری ٹھہری
کوئی کب تک بچائے گا دلِ نافہم و ناداں کو

اِشاروں سے تو لگتا ہے ہمارا ذکر ہے لیکن
خدا جانے وہ کیا سمجھا رہے ہیں وہ اپنے درباں کو

یہ لگتا ہے کہ دیوانہ رہائی پانے والا ہے
بڑی حسرت سے تکتا ہے در و دیوارِ زنداں کو

تم جو چاہو تو مِرے ہاتھ پر بیعت نہ کرو
ہاں مگر مجھ سے اُلجھنے کی جسارت نہ کرو

خیر خواہوں میں ہو تم مجھ کو ہے تسلیم مگر
کام کی بات کرو صرف نصیحت نہ کرو

وقت کی دھوپ نے دونوں پہ اثر ڈالا ہے
میں بھی شکوہ نہ کروں تم بھی شکایت نہ کرو

مفلسی نے ہمیں اِس حال کو پہنچایا ہے
چاک دامانی سے اندازۂ وحشت نہ کرو

آتشِ شوق کو کچھ اور ہوا مِلتی ہے
جب وہ شرما کے یہ کہتے ہیں شرارت نہ کرو

اب کہاں قدر شناسی کا زمانہ ہے شکیلؔ
کوئی مِل جائے خریدار تو قیمت نہ کرو

سُنا ہے یار تجھے جھوٹ سے محبت ہے
میں کیا کروں مجھے سچ بولنے کی عادت ہے

اگر میں چاہوں تو ہجرت بھی کر نہیں سکتا
مِرا وجود مِرے شہر کی امانت ہے

مِٹا نہ دے کہیں آپس کا اختلاف ہمیں
مِلاؤ ہاتھ کہ یہ وقت کی ضرورت ہے

وہ معترض ہے مِرے قد پہ کیا کِیا جائے
وجود شہر میں جس کا مِری بدولت ہے

گئے وہ دِن کہ شب و روز تھی ملاقاتیں
نہ آج آپ کو فرصت نہ مجھ کو فرصت ہے

دیا ہے دِل جو کسی کو تو پھر شکایت کیوں
شکیؔل یہ تو محبت نہیں تجارت ہے

اُس کا سینہ تو کدورت سے مزیّن نکلا
ہم جِسے دوست سمجھتے تھے وہ دُشمن نکلا

کیا ہوا ہوگا مِرا حال ذرا غور کرو
ناز تھا جس پہ مجھے مجھ سے وہ بد ظن نکلا

سب بتاتے تھے کہ مغرور بہت ہے لیکن
ہم مِلے اُس سے تو وہ شخص فِروتن نکلا

یہ اگر پیار نہیں ہے تو بتاؤ کیا ہے ؟
سُن کے آواز مِری گھر سے وہ فوراً نکلا

چوستا رہتا ہے ہر دم مِری محنت کا لہو
وہ مدد گار حقیقت میں مہاجن نکلا

ہم تو آسودہ بہت تجھ کو سمجھتے تھے مگر
تیرا سینہ تو غم و رنج کا مخزن نکلا

بات بے بات اڑے رہتے ہو تم اب بھی شکیلؔ
اس بڑھاپے میں بھی فطرت سے نہ بچپن نکلا

ہونٹوں سے مِرے روٹھ گیا حرف دُعا بھی
کیا میری طرح ہے کوئی پابند وفا بھی

مائل بہ کرم بھی نظر آتا ہے خفا بھی
ہے اُس کی توجہ میں تغافل کی ادا بھی

چاروں ہیں مِری جان مِری جان کے دُشمن
شوخی بھی شرارت بھی تبسم بھی حیا بھی

تم مانگنے والوں کو حقارت سے نہ دیکھو
یہ لوگ بدل دیتے ہیں قسمت کا لکھا بھی

دُنیا میں تگ و دو ہے تقابل کی بدولت
ہوتی نہ اگر رات تو جلتا نہ دیا بھی

حالات اگر میرے مخالف نہیں ہوتے
چلتا نہیں کچھ لوگوں کی فطرت کا پتہ بھی

صحرا میں نظر آتا ہے گلزار کا نقشہ
لگتا ہے کہ گزرا ہے کوئی آبلہ پا بھی

کانٹوں کو جو دیتا ہے کھٹکنے کا سلیقہ
کلیوں کو سکھاتا ہے چٹخنے کی ادا بھی

کافی ہے شکیلؔ اُس کی ہلاکت کے لیے بس
اِنسان میں آجائے جو تھوڑی سی انا بھی

○

تھا میرا وجود اِک نئی مہکار کی زد میں
وہ مجھ پہ جھکا شاخِ صنوبر کی طرح تھا

ظلم ہو چاہے کسی پر نہیں دیکھا جاتا
حق پرستوں سے یہ منظر نہیں دیکھا جاتا

کٹ کے گرتے ہیں کہاں سر نہیں دیکھا جاتا
جنگ جاری ہو تو مڑ کر نہیں دیکھا جاتا

راستے کھُل گئے پیغام رسانی کے بہت
اب کسی چھت پہ کبوتر نہیں دیکھا جاتا

سیج پھولوں کی نظر آتی ہے پتھریلی زمیں
نیند آتی ہے تو بستر نہیں دیکھا جاتا

چاند کھڑکی سے نظر آتا ہے اب بھی لیکن
بن تمہارے کوئی منظر نہیں دیکھا جاتا

لوگ حالات سے سمجھوتہ کیے بیٹھے ہیں
اب کسی ہاتھ میں پتھر نہیں دیکھا جاتا

اپنے ہونے کا میں احساس دلاؤں کیسے
دیکھ کر بھی مجھے اکثر نہیں دیکھا جاتا

بے سبب لوگ عداوت پہ اُتر آتے ہیں
خوش کسی کو بھی گھڑی بھر نہیں دیکھا جاتا

وہ بھی دروازے پہ رُکتے نہیں رُخصت کر کے
اور اب مجھ سے بھی مڑ کر نہیں دیکھا جاتا

سخت حالات میں جینے کو جو عادی ہیں شکیلؔ
اُن کی آنکھوں میں کبھی ڈر نہیں دیکھا جاتا

کوئی قطار سے باہر کوئی قطار میں ہے
ہر آدمی تِری رحمت کے انتظار میں ہے

میں لوٹ آؤں کہاں میرے اختیار میں ہے
مِری سفینہ تو دریائے بے کنار میں ہے

انا کے خول سے نکلا تو خون روئے گا
ابھی وہ خواہشِ بے جا کے اختیار میں ہے

ہمارے دِل کو تسلی ہے اس تعلق سے
کسی کی جیت کی خوشبو ہماری ہار میں ہے

بڑا سمجھتا ہے خود کو وہ اُس کو سمجھاؤ
کہ آدمی کی بڑائی تو انکسار میں ہے

تِرے نہ ہونے سے محسوس ہو رہا ہے مجھے
اداس اداس گلستاں بھری بہار میں ہے

کسی سے ملنے کی فرصت نہیں کسی کو شکیلؔ
جِسے بھی دیکھئے مصروف کاروبار میں ہے

مجھے یہ ضد کہ نہ دامن کبھی پساروں میں
وہ چاہتا ہے کہ اپنی انا کو ماروں میں

خدا کرے کہ وہیں ڈوب جائے میرا وجود
اگر کسی کو مدد کے لیے پکاروں میں

اندھیری رات ہوائیں خلاف ساحل دؤر
تِری رضا ہو تو پھر ہاتھ پاؤں ماروں میں

شکست و فتح تو قسمت کی بات ہے اے ماں
دُعا یہ دے کہ کبھی حوصلہ نہ ہاروں میں

گھٹا ، بہار، دھنک ، چاندنی ، صبا ، شبنم
نشاطِ جاں تجھے کس نام سے پکاروں میں

شکیلؔ جن کے لیے لڑ رہا ہوں دُنیا سے
عجب نہیں کہ انہیں دوستوں سے ہاروں میں

مِرے لئے خس و خاشاک و خار رکھ دینا
مگر نصیب میں اُس کے بہار رکھ دینا

بُلندیاں مِرے یاروں کو دے مگر یارب
طبیعتوں میں ذرا انکسار رکھ دینا

حَکَم بنا کے خوشامد طلب حلیفوں کو
کہیں نہ داؤں پہ اپنا وقار رکھ دینا

اِسی زمین سے میں پا برہنہ نکلا تھا !
اِسی زمیں پہ مِرا اقتدار رکھ دینا

وطن میں رہ کے بھی لطفِ وطن سے ہیں محروم
ہمارا نام غریب الدّیار رکھ دینا !

اندھیری رات کا افسوں جو توڑ نا ہے شکیلؔ
کوئی چراغ سرِ رہ گزار رکھ دینا

نظر سے دور رہا وہ مگر خبر میں رہا
کہ فاصلہ بھی مِرے قرب کے اثر میں رہا

طلب کے ساتھ جسارت بہت ضروری ہے
وہ نا مُراد رہا جو اگر مگر میں رہا

ضرورتوں کے تقاضے تھے اور شکستہ بدن
تمام عمر یہی معرکہ نظر میں رہا

لہو محاذ پہ بہتا رہا جوانوں کا
وہ جنگ چھیڑ کے محفوظ اپنے گھر میں رہا

تمام عمر رہا وصل کل کے وعدے پر
تمام عمر میں تزئینِ بام و در میں رہا

ہمیں نہیں تھے تجھے لوگ بھی تو دیکھتے تھے
یہ اور بات تفاوت نظر نظر میں رہا

میں اُس کے لمس کی لذت بُھلا سکا نہ شکیلؔ
وہ روشنی کی طرح میری رہ گزر میں رہا

بھرا ہوا تھا دِلوں میں غبار کیا کرتے
وہ رسم و راہِ وفا استوار کیا کرتے

وہاں تو سب کے ہی دامن پہ تھے گناہ کے داغ
وہ لوگ مجھ کو بھلا سنگسار کیا کرتے

بڑا یقین تھا دِل کو کسی کے وعدے پر
ہم انتظار نہ کرتے تو یار کیا کرتے

منافقت نہیں شامل ہماری فطرت میں
حریف ہم کو بھلا شرم سار کیا کرتے

ہم اُس کو روح کی گہرائیوں سے چاہتے تھے
یہ بات سچ ہے مگر اشتہار کیا کرتے

یہ واقعہ ہے کہ اُس کو وفا نہیں آتی
شکیؔل ہم کوئی قول و قرار کیا کرتے

مِرے اندر کا جو سنّاٹا بکھر جائے گا
دیکھنا دیکھ کے ویرانہ بھی ڈر جائے گا

جان دے کر بھی رہے اُس کی نظر میں معتوب
ہم تو سمجھے تھے کہ احسان اُتر جائے گا

دُکھ تو اِس کا ہے کہ رشتوں کا بھرم ٹوٹ گیا
زخم کا کیا ہے میاں زخم تو بھر جائے گا

ہو گیا ہے وہ مِرے قرب کا عادی اِتنا
اب اگر دوٗر گیا مجھ سے تو مر جائے گا

کیا خبر تھی کہ وہ روتے ہوئے جانے والا
خواب بن کر مِری آنکھوں میں ٹھہر جائے گا

زاویہ اپنی نگاہوں کا بدلیے ورنہ
مِرے اندر جو فرشتہ ہے وہ مر جائے گا

اُس سے کہہ دو کہ جوانی پہ نہ اِترائے شکیلؔ
یہ تو چڑھتا ہوا دریا ہے اُتر جائے گا

سُنا ہے جان لے کر دوست پیچھا چھوڑ دیتے ہیں
اگر یوں چھوڑ دیتے ہیں تو رستا چھوڑ دیتے ہیں

عذابِ آگہی سنجیدہ کر دیتا ہے فطرت کو
شعور آتے ہی بچے مسکرانا چھوڑ دیتے ہیں

تعلق کے لیے کچھ وصف کا ہونا ضروری ہے
پرندے بے ثمر پیڑوں پہ آنا چھوڑ دیتے ہیں

○

پتا چلا کہ بہانہ بنا کے پت جھڑ کا
بہار اُس کی گلی میں قیام کرتی ہے

○

روشن جب تک ذہنوں کی قندیل نہ ہوگی
اچھی باتوں کی ہرگز ترسیل نہ ہوگی

سورج سپاہِ شام کے نرغے میں ہے شکیلؔ
یونہی فصیلِ شب پہ چراغاں نہیں ہوا

○

جو اصل سے کٹتے ہیں کہیں کے نہیں رہتے
بکھری ہوئی خوشبو کا ٹھکانہ نہیں ہوتا

○

اپنے آپ سے شرمندہ ہوں ٹوٹ گیا معصوم کا دِل
ناحق میں اپنے بچے کو ساتھ لیے بازار گیا

○

دُکھ تو اِس کا ہے کہ رشتوں کا بھرم ٹوٹ گیا
زخم کا کیا ہے میاں زخم تو بھر جائے گا

مزدور کی عید

ہر طرف اِک شور اُٹھّا آگیا ماہِ صیام
روزہ رکھنے کے لئے ہونے لگا ہے اہتمام

بڑھتا جاتا ہے دُکانوں پر مسلسل اژدہام
ہے مگر مزدور کی حسرت ابھی تک ناتمام

پیٹ بھرنے کے لئے دِن رات مزدوری کروں
کِس طرح آخر ضرورت عید کی پوری کروں

دِن قریب آنے لگا ہے دھیرے دھیرے عید کا
چھوٹتا جاتا ہے دامن ہاتھ سے اُمید کا

دیکھ کر بچوں کی صورت ڈوبتا جاتا ہے دِل
سوچ کر حالات کے بارے میں گھبراتا ہے دِل

بس یہی اِک فکر کھائے جا رہی ہے صبح و شام
کس طرح ہوگا نئے کپڑوں کا آخر انتظام

جیسے تیسے کرکے بچّوں کے تو کپڑے سِل گئے
دِل بہت خوش ہے کہ معصوموں کے چہرے کِھل گئے

کہہ کہ یہ بیوی نے سر کا بوجھ ہلکا کر دیا
سینت کر رکھّا ہے جوڑا میں نے پچھلی عید کا

مسئلہ اب سامنے ہے صرف اپنی ذات کا
رُخ کسی صورت بدل ڈالوں گا میں حالات کا

میں نے سوچا قرض لے آؤں گا ساہوکار سے
منہ کو لٹکائے ہوئے آنا پڑا بازار سے

اُس نے بتلایا کہ کاروبار کب سے بند ہے
یعنی مجھ سے بھی زیادہ وہ ضرورت مند ہے

سوچتا ہوں عید اب کیسے مناؤں ؟ کیا کروں ؟
روؤں اپنے حال پر یا مسکراؤں کیا کروں ؟

لوگ دیکھیں گے تو منہ اپنا چھپاؤں گا کہاں
عید کے دِن چھوڑ کر گھر اپنا جاؤں گا کہاں

جب نئے کپڑے پہن کر دوست مِلنے آئیں گے
خود بھی شرما جاؤں گا میں ، وہ بھی شرما جائیں گے

آئیں گے بچے مبارکباد پانے کے لئے
حوصلہ دینا خدایا مسکرانے کے لئے

○

کسی غریب کا کب احترام کرتی ہے
لباس دیکھ کے دُنیا سلام کرتی ہے

ماں سے یتیم بچّے کا سوال

میرے ابو ہیں پردیس میں امّی تم بتلاتی ہو
اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہتیں بس تم چپ ہو جاتی ہو

سارے بچے دیکھتے ہیں جب خوش ہو ہو کر عید کا چاند
میری آنکھوں میں روشن ہو جاتا ہے اُمید کا چاند

میں کہتا ہوں میرے ابو اب کے عید پہ آئیں گے
ڈھیروں کپڑے اور کھلونے میری خاطر لائیں گے

ہاتھ پکڑ کر ابو کا میں بھی میلے میں جاؤں گا
رنگ برنگے کپڑے پہنے ہر سُو دھوم مچاؤں گا

ایسی باتیں کہتے کہتے کتنے موسم بیت گئے
اب کے برس بھی ہار گیا میں میرے ساتھی جیت گئے

اوروں کے ابو بھی تو پردیس کمانے جاتے ہیں
لیکن وہ ہر سال برابر عید منانے آتے ہیں

مجھ کو تو ایسا لگتا ہے تم یوں ہی بہلاتی ہو
مجھ کو بھی دھوکہ دیتی ہو خود بھی دھوکہ کھاتی ہو

اچھی امّی پیاری امّی دِل کیوں چھوٹا کرتی ہو
تم مجھ کو سچّائی بتلانے سے ناحق ڈرتی ہو

دھیرے دھیرے سمجھ رہا ہوں میں اِن ساری باتوں کو
تم اُٹھ اُٹھ کر اکثر کیوں روتی رہتی ہو راتوں کو

ابو کی تصویر سے اکثر باتیں کرتی رہتی ہو
کیا جانے کیا کیا کہہ کہہ کر آہیں بھرتی رہتی ہو

چھوڑو مایوسی کی باتیں جب میں بڑا ہو جاؤں گا
خون پسینہ ایک کروں گا پیسے خوب کماؤں گا

غم کی راتیں کٹ جائیں گی خوشیوں کے دِن آئیں گے
ہم بھی نئے کپڑے پہنیں گے ہم بھی عید منائیں گے

بیٹی کی رُخصتی پر باپ کی نصیحت

آج اے لختِ جگر تجھ کو جُدا کرتے ہیں
سُنتِ سرورِ کونین ادا کرتے ہیں

اپنے ماں باپ پہ تو بار نہیں ہے بیٹی
تیری چاہت سے بھی انکار نہیں ہے بیٹی

دِل کو سمجھا لے کہ اِک فرض ادا ہوتا ہے
شاخ سے پھول بہر حال جُدا ہوتا ہے

تو نہیں ہوگی تو ویران نظر آئے گا گھر
شاق گزرے گی بہت تیری جُدائی دِل پر

یہی دستور ہے دُنیا کا نہیں اِس سے مفر
تجھ کو کرتے ہیں جُدا سینے پہ پتھر رکھ کر

ترے ہاتھوں میں ہے ماں باپ کی عزت بیٹی
یاد رکھنا تو ہمیشہ یہ نصیحت بیٹی

جو یہ خواہش ہے کہ روشن ہو ترا مستقبل
کبھی احکام خدا سے نہ تو ہونا غافل

کرنا تو پیرویٔ بنتِ شہنشاہِ زمن
تجھ سے چھوٹے نہ کبھی صبر و رضا کا دامن

اپنے شوہر کی اطاعت سے نہ منہ موڑنا تو
دامنِ صبرو قناعت نہ کبھی چھوڑنا تو

تو کسی بات پہ شوہر سے نہ حجت کرنا
روک دے تجھ کو وہ جس کام سے وہ مت کرنا

ٹالنا مت کبھی اُس کا کوئی کہنا بیٹی
اُس کی مرضی کے مطابق ہی تو رہنا بیٹی

اپنے سسرال کی عزت کا رہے تجھ کو خیال
تیرے چہرے سے نہ ظاہر ہو کبھی رنج و ملال

نہیں ماں باپ سے کم تیرے لئے ساس سُسر
اُن کی خدمت میں نہ بھولے سے رہے کوئی کسر

ہے بزرگوں کی اطاعت میں بڑا اجر و ثواب
ساس کو اپنی پلٹ کر نہ کبھی دینا جواب

ایک بیٹی کی طرح کرنا تو یہ مرحلہ طے
ساس ڈانٹے تو سمجھ لینا کہ ماں ڈانٹتی ہے

تیز لہجے میں کبھی بات نہ کرنا بیٹی
شکوۂ گردشِ حالات نہ کرنا بیٹی

کاہلی کا کبھی الزام نہ سر پر لینا
کام جو سامنے آجائے اُسے کر لینا

اپنی نندوں سے تو ہرگز نہ لڑائی کرنا
بھول کر بھی نہ کبھی اپنی بڑائی کرنا

پھوٹ پڑنے نہیں دینا کبھی اپنے گھر میں
کوئی شاکی نہ رہے تجھ سے محلے بھر میں

خندہ پیشانی سے پیش آنا تو ہر ایک کے ساتھ
درد مندوں کی مدد سے نہ کبھی روکنا ہاتھ

جا مِری بیٹی تو خوش حال رہے شاد رہے
میں رہوں یا نہ رہوں گھر تِرا آباد رہے

ہر گام اُس کو مِلتا ہے سایہ مزے میں ہے
جب سے ہمارے ساتھ ہے صحرا مزے میں ہے

رہتا ہے اتصال کی لذت سے شاد کام
دریا میں مِل گیا جو وہ قطرہ مزے میں ہے

دو چند ہو گیا ہے وقار اُس کا دہر میں
آئینہ پا کے عکس تمہارا مزے میں ہے

اپنے تعلقات پہ کچھ غور کیجئے
دُنیا کی بات چھوڑیئے دُنیا مزے میں ہے

تنہائیوں سے کھیلتا رہتا ہوں رات دِن
پوچھے وہ میرا حال تو کہنا مزے میں ہے

آزاد ہو گیا ہے وہ روزی کی فکر سے
پنجرے میں قید ہے جو پرندہ مزے میں ہے

پرکھا ہے ہم نے تجھ کو کئی بار اے شکیلؔ
رہتا نہیں مگر نظر آتا مزے میں ہے

نہ رُکا نہ میں رُکوں گا کبھی حادثوں کے ڈر سے
کہ مسافرِ ازل ہوں مجھے کام ہے سفر سے

تجھے تب پتہ چلے گا کہ ہے کیا مقامِ حیرت
تِری آنکھ جب مِلے گی کسی صاحبِ نظر سے

نہ مِلی کسی کی چاہت نہ مِلی کسی کی شفقت
مِری طرح یوں خدایا کوئی پیار کو نہ ترسے

یہی روز کا تماشہ ہے جہانِ رنگ و بو میں
کوئی چڑھ گیا نظر پر کوئی گِر گیا نظر سے

نہیں مجھ میں اِتنی طاقت کروں خود کی میں حفاظت
مِرا رب بچا رہا ہے مجھے دُشمنوں کے شر سے

شکیلؔ ابن شرفؔ صاحب کا اجمالی تعارف

محمد ساجد زاہد (راؤ صاحب)

اللہ کا کرم ہے کہ اُس نے مجھے اپنے چہیتے شاعر شکیلؔ ابن شرفؔ صاحب کے متعلق چند سطریں تحریر کرنے کی سعادت نصیب فرمائی۔ شکیلؔ ابن شرف کا تعلق اُس علمی گھرانے سے ہے جس میں محمد یحییٰ شرفؔ، ابوشحمہ ظفرؔ، غلام رسول اطہرؔ، سراج احمد سراجؔ انصاری اور ابواحمد وحشیؔ جیسے با کمال افراد شامل ہیں۔

۱۵ مارچ ۱۹۵۵ء کو محمد یحییٰ شرفؔ کے یہاں آپ کی ولادت ہوئی۔ ابھی آپ ۸ سال ہی کے تھے کہ آپ کی والدہ کا سایہ آپ کے سر سے اُٹھ گیا۔ ۹ سال کی عمر میں والد صاحب نے بھی داعئ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ بچپن میں ہی والدین کی شفقت سے محروم ہونے پر آپ کی پھوپھی نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا لیکن تین سال کے قلیل عرصہ میں وہ بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ جس کے بعد بہن اور بہنوئی نے پرورش کی ذمہ داری اُٹھائی۔ ان روح فرسا حالات سے سبب طبیعت حساس اور دِل گداز ہو گیا۔ چونکہ بچپن سے ہی معاشی جد وجہد شروع ہو گئی تھی اس لیے تعلیمی سلسلہ نویں جماعت سے ہی منقطع ہو گیا لیکن علمی ذوق کی تسکین کے لئے شعر گوئی کی خداداد صلاحیت نے بھر پور ساتھ دیا۔ حسن اتفاق سے الحاج عبدالوہاب انجم صاحب کی صحبت علمی نصیب ہوگئی۔ جس کی بدولت شعر وفن کی باریکیوں کے ساتھ فارسی زبان پر بھی دسترس حاصل ہوگئی۔ ابتداء میں اپنے عم محترم اطہرؔ حنفی صاحب سے اصلاح سخن لی اور اطہرؔ صاحب کے انتقال کے بعد حضرت شمس الدین زاہدؔ کی شاگردی اختیار کی۔ جو پہلے ہی زبان وفن کے باریکیاں سمجھاتے رہتے تھے۔ شکیلؔ ابن شرفؔ کی جودتِ طبیعت، رفعتِ تخیل اور مضمون آفرینی سے متاثر ہو کر حضرتِ زاہدؔ نے شکیلؔ ابن شرفؔ کو اپنا

چہیتا شاگرد قرار دیا

وہ ہمیشہ شکیلؔ ابن شرفؔ کا ذکر فخر سے کیا کرتے تھے۔ان اساتذہ کی نگرانی میں یہ ننھا پودا اس طرح پروان چڑھا کہ آج ایک انتہائی گھنا سایہ دار درخت ہو کر سرزمین دھولیہ کے باکمالوں کے کمال میں چار چاند لگا رہا ہے۔دھولیہ کی ادبی تاریخ گیسوئے اردو کو سنوارنے والوں میں شکیلؔ ابن شرفؔ کا نام اپنی تمام تر تابنا کیوں کے ساتھ نمایاں نظر آتا رہے گا۔شکیلؔ صاحب کی ذات خودداری ،اخلاق و محبت اور رواداری کا مرقع ہے۔زندگی کے پُرخار راستوں پر نامساعد حالات میں اپنی وضع پر قائم رہنا

شکیلؔ ابن شرفؔ صاحب کا قابل قدر کارنامہ ہے۔اللہ سے دُعا ہے کہ آپ کا سایہ تادیر ہمارے سروں

پر قائم رکھے۔...آمین!

احقرالعباد محمد ساجد زاہد انجینئر

MAHKAR (POETRY)

SHAKEEL IBN SHARAF



اس بات سے واقف ہیں شکیلؔ اہلِ بصیرت
ہے شہرِ سخن میں مری پہچان مجھی سے

BAZM-E-MUHIBBAN-E-SHAKEEL IBN SHARAF
MACHCHLI BAZAR-DHULE-424001

Printed At: Noorani Offset Press, Malegaon 9372436080